ذوالقعدہ ۱۴۴۰ھ
جولائی ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

محمد مُرسی کی شہادت:
اِحیائی تحریکوں کے لیے لمحۂ فکریہ

ایوب بیگ مرزا

جاری کردہ
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داخلے جاری ہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

رجوع الی القرآن کورسز (پارٹ I اور II)

یہ کورسز بنیادی طور پر تعلیم یافتہ افراد کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں' تاکہ وہ حضرات جو کم از کم انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' ان کورسز کے ذریعے ان کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے۔ ہفتے میں پانچ دن روزانہ صبح کے اوقات میں تقریباً پانچ گھنٹے تدریس ہوگی۔ ہفتہ وار تعطیل ہفتہ اور اتوار کو ہوگی۔

نصاب (پارٹ I) برائے مرد و خواتین (کوالیفکیشن: انٹرمیڈیٹ پاس کیا ہو)

1. عربی صرف و نحو
2. ترجمۂ قرآن (مع تفسیری توضیحات)
3. سیرت النبی ﷺ
4. قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
5. تجوید و ناظرہ
6. مطالعۂ حدیث و فقہ العبادات
7. اصطلاحاتِ حدیث
8. اضافی محاضرات

نصاب (پارٹ II) صرف مرد حضرات (کوالیفکیشن: پارٹ (I) پاس کیا ہو)

1. مکمل ترجمۃ القرآن (مع تفسیری توضیحات)
2. مجموعۂ حدیث
3. فقہ
4. اصولِ تفسیر
5. اصولِ حدیث
6. اصولِ فقہ
7. عقیدہ
8. عربی زبان و ادب
9. اضافی محاضرات

انٹرویو کی تاریخ: **22** جولائی (صبح 9:00 بجے)
کلاسز کا آغاز: **23** جولائی (صبح 8:00 بجے)

داخلہ کے خواہشمند ایک تصویر، شناختی کارڈ کی کاپی اور انٹرمیڈیٹ کی سند کی کاپی کے ہمراہ **19** جولائی تک رجسٹریشن کروالیں

برائے رابطہ
قرآن اکیڈمی
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: (042) 35869501-3
email:lrts@tanzeem.org
ملک شیر افگن (مرد حضرات) 0300-4201617
(خواتین آفس) (042) 35869501-3

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد : 68
شمارہ : 7
ذوالقعدہ 1440ھ
جولائی 2019ء
فی شمارہ -/40

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	400 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
محمد مرسی کی شہادت:
احیائی تحریکوں کے لیے لمحۂ فکریہ — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 9
سورۃ المؤمن (آیات ۲۳ تا ۵۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ قرآن حکیم — 26
خاندانی زندگی کے بنیادی اصول — شجاع الدین شیخ

حقیقتِ دین — 39
تزکیۂ نفس: کچھ گزارشات — محمد رشید عمر

انوارِ ہدایت — 44
قرآن مجید کو سمجھے بغیر پڑھنا — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تعلیم و تعلّم — 51
طالب علم کا اخلاق کیسا ہونا چاہیے؟ — ڈاکٹر محمد امین

یادِ رفتگان — 67
میرے استاد: میرے محسن — ڈاکٹر حافظ ظفر احمد

اسلام اور سائنس — 73
ڈارون کا نظریۂ ارتقاء: ایک خطرناک دھوکہ — ڈاکٹر محمد سرشار خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد مرسی کی شہادت:
احیائی تحریکوں کے لیے لمحۂ فکریہ

مصر کی جدید تاریخ کے پہلے غیر فوجی اور جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے صدر محمد مرسی ۲۰ اگست ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے اور قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کی۔ مرحوم بعد میں کیلیفورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی نارتھرج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر پڑھاتے رہے۔ محمد مرسی ۱۹۸۵ء میں وطن واپس پہنچے اور تدریس کے ساتھ سیاسی سفر کا بھی آغاز کیا۔ جماعت الاخوان المسلمون کے اراکین پر حسنی مبارک کے دور میں پابندی تھی کہ وہ الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے۔ پابندیوں کا شکار مذکورہ جماعت نے ۲۰۱۱ء میں مرسی کی قیادت میں فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی قائم کی۔ مئی ۲۰۱۲ء میں مصری صدارتی انتخابات کا انعقاد ہوا۔ جون ۲۰۱۲ء میں مصر کے قومی الیکشن کمیشن نے اعلان کیا کہ مرسی ۵۱٫۷ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُسی روز نومنتخب صدر محمد مرسی نے التحریر سکوائر پر لاکھوں کے مجمعے میں فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کی رکنیت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور کہا کہ وہ صرف مصری عوام کے صدر ہیں۔ انہوں نے ۲۰ جون ۲۰۱۲ء کو مصر کے جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والے پہلے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

جون ۲۰۱۳ء میں ان کے اقتدار کا ایک سال مکمل ہونے پر تحریر سکوائر اور مصر کے دیگر شہروں میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ مصری فوج نے یکم جولائی ۲۰۱۳ء کو محمد مرسی کو پیغام بھجوایا کہ ۴۸ گھنٹوں میں مظاہرین کے مطالبات پورے کریں، بصورت دیگر اُنھیں اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا۔ اُس وقت کے فوجی سربراہ اور موجودہ صدر عبدالفتاح السیسی کی قیادت میں مصری فوج نے تین جولائی کو محمد مرسی کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا۔ مصری ذرائع ابلاغ کے

مطابق محمد مرسی اور ۱۳۲ دوسرے افراد پر ۲۰۱۱ء میں جیل توڑنے، ملکی دفاعی راز افشا کرنے، غیر ملکی دہشت گرد تنظیموں خصوصاً اسرائیل کے خلاف برسرِ پیکار جماعت حماس کے ساتھ تعاون اور ان کے ذریعے مصر میں دہشت گردی پھیلانے کے الزام میں مقدمات بنائے گئے، جن کی بناء پر صدر مرسی کو سزائے موت سمیت متعدد سزائیں سنائی گئیں۔

ساڑھے تین سال قبل ۱۵ نومبر ۲۰۱۶ء کو مصر کی اعلیٰ ترین عدالت نے سابق صدر محمد مرسی کو سنائی جانے والی موت کی سزا کو ختم کر دیا تھا، لیکن ان کے خلاف دیگر مقدمات آخری دم تک زیرالتوا رہے۔ جیل میں چھ سالہ اسیری کے دوران انہیں لیٹنے کے لیے صرف خالی فرش میسّر رہا اور اہل خانہ سے بھی صرف چار ملاقاتیں ہی نصیب ہوئیں۔ محمد مرسی گزشتہ روز عدالت میں ایک پیشی کے موقع پر اچانک گر کر بے ہوش گئے اور بعد ازاں مصر کے سرکاری ٹی وی نے خبر دی کہ ملک کے سابق صدر انتقال کر گئے۔ مصر کے پہلے منتخب سابق صدر محمد مرسی کو قاہرہ کے مشرقی علاقے مدینۃ النصر میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے جنازے اور تدفین میں چند قریبی رشتہ داروں کو ہی شرکت کی اجازت دی گئی۔ الاخوان المسلمون سمیت مصر کے کئی حلقوں نے محمد مرسی کی حراست میں وفات کی آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔

یہ مصر کی تاریخ کے پہلے منتخب صدر ڈاکٹر حافظ محمد مرسی کا تعارف اور اُن سے ہونے والے انسانیت سوز سلوک کی مختصر داستان ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ منتخب صدر کو گن پوائنٹ پر برطرف کرنا اور پھر جیل میں اُن سے ایسا سلوک کہ وہ سسک سسک کر بالآخر دم توڑ جائیں، مصر کی اپنی اسٹیبلشمنٹ کا فیصلہ تھا یا اُن خاص عالمی قوتوں کا فیصلہ تھا جو دنیا بھر میں کہیں بھی اسلام کی طرف پیش رفت ہو، یا ایسا کوئی امکان بھی پیدا ہو جائے تو متحرّک ہو کر میدان میں کود پڑتی ہیں اور اُس فرد، گروہ یا جماعت سے وہ سلوک کرتی یا کرواتی ہیں جو محمد مرسی کے ساتھ ہوا۔ ہماری رائے میں اِس سوال کا مُسکت جواب یہ ہے کہ یہ اسلام دشمن عالمی قوتوں کا فیصلہ ہوتا ہے، ملکی اسٹیبلشمنٹ اِس پر عملدرآمد کرتی ہے، کیونکہ مقامی مقتدر قوتوں کو بھی اقتدار اور حصولِ قوت کی بے لگام خواہش نے مغلوب کر رکھا ہوتا ہے اور وہ عذر کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے اِن اسلام دشمن عالمی قوتوں کا تعلق مغرب سے ہے اور ان کا گُرو امریکہ ہے۔ یہ قوتیں جمہوریت اور انسانی حقوق کو اپنے ایمان کا حصہ قرار دیتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے عالمی عسکری اور تہذیبی غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے اِس ایمان کی بدترین نفی اور اپنے نظریات کا کفر

بڑی ڈھٹائی بلکہ بے شرمی کے ساتھ کرنے کو ہر دم تیار رہتی ہیں۔ جمہوریت کے اِن ہی علمبرداروں بلکہ ٹھیکے داروں نے مصری فوجی آمریت کی منتخب صدر کے خلاف بغاوت کی نہ صرف حمایت کی' بلکہ آگے بڑھ کر کھلم کھلا اُن سے عملی تعاون کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن عالمی قوتوں کو شرعِ پیغمبرؐ کے آشکارا ہونے کا خطرہ ہے۔ ظالم اور استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کو خطرہ ہے اور امریکہ اِس ظالمانہ نظام کے بل بوتے پر بائیسویں صدی میں عالمی شہنشاہیت کا تاج برقرار رکھتے ہوئے داخل ہونا چاہتا ہے۔ لہٰذا اپنی عالمی چودھراہٹ کے تحفظ کے لیے کہیں آمریت کا عذر تراش کر حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی اپنے چہرے سے جمہوریت کے نقاب کو نوچ کر پھینک دیتا ہے اور منتخب حکومت اور صدر کے خلاف سازشیں کرتا ہے' تاکہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ سے جو خطرہ استحصالی سرمایہ پرست نظام کو لاحق ہوسکتا ہے' اُسے ٹالا جا سکے۔ ماضی قریب کی تاریخ کا جائزہ لیں۔ الجزائر انتخاب اور جمہوریت کے ذریعے اسلام کے قریب جائے تو سیکولر فوج کو آلۂ کار بنا کر الجزائر کے ہیوی مینڈیٹ کو کچل دو۔ الاخوان المسلمون اگر تحریکی راستہ اختیار کریں تب کچل دو' اور اگر جمہوریت کی سیڑھی چڑھ کر اقتدار حاصل کریں تو کچل دو۔ افغان طالبان اگر بزورِ بازو اقتدار حاصل کریں اور ایک اسلامی ریاست قائم کریں یا اس کے لیے کوشش کریں تو ساری دنیا کو اکٹھا کر کے اُن پر حملہ آور ہو جاؤ' اور اگر افغان طالبان بیرونی حملہ آوروں سے جنگ کریں اور اُن کے ملک سے نکل جانے کا مطالبہ کریں تو وہ دہشت گرد قرار پائیں۔ قصہ مختصر مغرب کا اصل الاصول یہ سامنے آیا ہے کہ اگر اسلام کے نفاذ کو روکنے کا مسئلہ درپیش ہو تو کسی اُصول' ضابطے' اخلاق' قانون اور نظریہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے' لہٰذا فرعونیت اختیار کرو یا منافقت برتو۔

ہماری رائے یہ ہے کہ جب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے تو اُمتِ مُسلمہ اسلام دشمن عالمی قوتوں کے اِس فریب کو چاک تو کرے' اُن کی اس دورُخی سے دنیا کو آگاہ تو کرے۔ لیکن کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جس نظام سے مغرب خوفزدہ ہے' جس کے بارے میں اُس کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ دنیا میں کسی ایک جگہ بھی صحیح طور پر نافذ ہوگیا تو ان کے سرمایہ دارانہ نظام کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور ان کا عالمی تسلط شدید خطرے سے دوچار ہو جائے گا' اُس عادلانہ نظام کو قائم کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ہماری رائے میں اُمتِ مُسلمہ کے پاس سرے سے کوئی اور آپشن موجود ہی نہیں۔ ہر نیکی اور نیکوکار کی ایک حیثیت ہے' ایک قدر ہے' جو یقیناً

فرد اور معاشرے پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے۔ مثلاً صوم وصلوٰۃ کی پابندی' دیانت داری' ہمسائے سے اچھا سلوک وغیرہ وغیرہ' ان میں سے کسی بھی نیکی کی قدر کو صحیح نہ جاننا حماقت ہوگی' جہالت ہوگی' بلکہ صحیح تر الفاظ میں ایک نوع کے جرم کا ارتکاب ہوگا۔ لیکن ہر دور کی ایک خاص نیکی بھی ہوتی ہے جسے ہم مرکزی نیکی یا محوری نیکی قرار دیں گے۔ آج یہ نیکی اسلام کے عادلانہ نظام کو کسی ایک ملک میں نافذ کرنا ہے (ظاہر ہے کسی ایک ملک سے اِس کا آغاز کرنا پڑے گا) وگرنہ دوسری تمام نیکیاں اپنا لینے کے باوجود اُمتِ مُسلمہ کے بحیثیت مجموعی حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے جائیں گے۔

مسلمان ممالک پر نگاہ ڈالیں' عرب ممالک دنیوی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود امریکہ اور اسرائیل کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بڑے بڑے تبلیغی اجتماع ہوتے ہیں' شاندار مساجد تعمیر ہوگئی ہیں' رونق بھی خوب ہے' لیکن بنگلہ دیش اسلام دشمن بھارت کی کاسہ لیسی کرتا ہے اور پاکستان جو کبھی امریکہ کے گھڑے کی مچھلی تھی آج کل دوسرے بلاک میں فٹ ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ البتہ جو کشکول پہلے بھی ہاتھ میں تھا' وہ اب سائز میں اور بڑا ہو گیا ہے۔ داخلی انتشار کا بُری طرح شکار ہے۔ پھر یہ کہ پاکستان ایک ایٹمی ملک ہے' لیکن ہر وقت تھر تھر کانپتا رہتا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات مغرب کو سمجھ آ گئی ہے' ہمیں سمجھ نہیں آئی۔ مغرب جان چکا ہے کہ اگر اُمتِ مُسلمہ متحد ہوگئی اور کوئی اسلامی فلاحی ریاست قائم ہوگئی تو مغرب کا نظام ڈھیر ہو جائے گا۔ دنیا خواہی نخواہی اُس نظام کی طرف بڑھے گی جو دنیا کو جنت نظیر بنا دے گا۔

ہم نے سطورِ بالا میں مسلم عوام کا ذکر کیا ہے' مسلمان حکمرانوں کی بات نہیں کی۔ یہ اِس لیے کہ اُن کا سدھرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے' کیونکہ اقتدار کی حرص انہیں احیائی تحریکوں کے خلاف استعمال ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ احیائی تحریکوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ کامیابی کی صورت میں بھی وہ عالمی قوتوں اور ان کے کٹھ پتلی مسلم حکمرانوں سے کیسے نبٹیں؟ ہمارے خیال میں صرف عوام کا زبردست پریشر ہی ہے جو اُن کو راہِ راست پر لا سکتا ہے یا راستے سے ہٹا سکتا ہے۔ اِسی کو انقلاب کہتے ہیں۔ یہ انقلاب بالآخر آ کر رہے گا اور مغرب کی نفاذِ اسلام کے خلاف تمام کوششیں ناکام ہوں گی۔ ان شاء اللہ!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الْمُؤْمِن

آیات ۲۳ تا ۲۷

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ
وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا
اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ
اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ
اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ
مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

اب آئندہ آیات میں ''مؤمنِ آلِ فرعون'' کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو اس سورت کا خاص مضمون ہے۔ وہ فرعون کے دربار میں بہت بڑے مرتبے پر فائز تھے۔ ظاہر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ اُن تک بھی پہنچی ہو گی۔ اس دعوت کے جواب میں اللہ نے ان کا سینہ کھول دیا اور وہ ایمان لے آئے۔ البتہ مصلحت کے تحت انہوں نے اپنے ایمان کا اظہار نہ کیا۔ پھر ایک موقع پر جب فرعون نے اپنی کابینہ کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تجویز رکھی تو اس مردِ حق سے خاموش نہ رہا گیا۔ چنانچہ فرعون کی اس تجویز کے جواب میں انہوں نے بھرے دربار میں ایک بہت مدلّل اور مؤثر تقریر کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ''حق گوئی و بے باکی'' کی پذیرائی یوں فرمائی کہ ان کی پوری تقریر کو قرآن کا حصہ بنا دیا۔ وہ نہ نبی تھے اور نہ رسول، لیکن ان کی طویل تقریر جس شان سے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمائی ہے اس کی کوئی مثال قرآن میں کسی نبی یا رسول کے حوالے سے بھی نہیں ملتی۔ ان کے اس خصوصی اعزاز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس شان سے اپنے بندوں کی قدر

افزائی فرماتا ہے۔

آیت ۲۳، ۲۴ ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ﴾ ''اور ہم نے بھیجا تھا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی سند کے ساتھ، فرعون، ہامان اور قارون کی طرف''

﴿فَقَالُوْا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے انتہائی جھوٹا۔''

یہی الفاظ مشرکینِ مکہ نے حضور ﷺ کے لیے کہے تھے جو سورۂ صٓ کی آیت ۴ میں نقل ہوئے ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ﴾ ''تو جب وہ آیا ان کے پاس ہماری طرف سے حق لے کر تو انہوں نے کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائیں ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھو۔''

﴿وَمَا کَیْدُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾﴾ ''لیکن کافروں کا داؤ بھٹک کر ہی رہ جاتا ہے۔''

اس سے پہلے ہم سورۃ الاعراف کے پندرھویں رکوع میں بھی سردارانِ قومِ فرعون کے اس مطالبے کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ آپ موسیٰؑ کو کب تک ڈھیل دیتے رہیں گے؟ لوگ دھڑا دھڑ اس پر ایمان لا رہے ہیں، روز بروز اس کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ملک کے اندر فساد پھیل رہا ہے۔ آپ اسے قتل کیوں نہیں کروا دیتے؟ لیکن جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ فرعون ایک وقت تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے سے کتراتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گویا اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا اور اس تعلق کی وجہ سے وہ دل میں آپؑ کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے لے کر بحیثیتِ رسولؑ فرعون کے سامنے آنے تک کے واقعات کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت رعمسیس دوم فرعون برسرِ اقتدار تھا۔ حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکال کر جب اس کے محل

میں لایا گیا تو اس کی بیوی نے کسی طرح اسے قائل کرلیا کہ اس بچے کو قتل نہ کیا جائے۔ اس موقع پر فرعون کی بیوی کے اپنے شوہر کے ساتھ مکالمے کو سورۃ القصص میں یوں نقل کیا گیا ہے:

﴿وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ۡ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (آیت ۹) ''اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ تم اسے قتل مت کرو، ممکن ہے کہ یہ ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں''۔ غالب گمان یہی ہے کہ وہ خاتون حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں جن کا ذکر سورۃ التحریم میں آیا ہے۔ اس وقت تک فرعون بے اولاد تھا۔ بعد میں اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ چنانچہ فرعون کا حقیقی بیٹا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سگے بھائیوں کی طرح اکٹھے رہے اور ایک ساتھ جوانی کی عمر کو پہنچے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کا قتل ہوگیا تو آپؑ مدین چلے گئے۔ مدین سے آپؑ کی واپسی کے زمانے میں بڑا فرعون اگرچہ زندہ تھا مگر بڑھاپے کی وجہ سے اس نے تمام امور سلطنت اپنے بیٹے (منفتاح) کو سونپ رکھے تھے۔ اس طرح عملی طور پر اس کا بیٹا ہی حکمران تھا جو ایک طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی اور بچپن کا ساتھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے بڑے بڑے سرداروں کے پُرزور مطالبے کے باوجود بھی وہ کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف انتہائی اقدام کرنے سے گریز کرتا رہا۔ پھر جب اُس نے کسی سخت اقدام کو ناگزیر سمجھا بھی تو آپؑ کی ذات کے بجائے آپؑ کی قوم کو نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت اس نے ایک دفعہ پھر حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے اور صرف ان کی بیٹیوں کو ہی زندہ رہنے دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اس تحریک کو کچلنے اور بنی اسرائیل کی طاقت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں اس کے اسی منصوبے کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے مخالفین کی کوئی چال بھی اللہ کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ﴾ ''اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور وہ (بچاؤ کے لیے) پکار لے اپنے رب کو۔''

فرعون کے اس فقرے کے اندر بہت سی اَن کہی تفصیلات کی جھلک بھی نظر آ رہی ہے۔ اوّلاً اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک فرعون بھانپ چکا تھا کہ پانی سر سے گزرنے کو

ہے اور یہ کہ اس مرحلے پر اگر موسیٰؑ کو قتل کر کے راستے سے نہ ہٹایا گیا تو یہ طوفان اس کے اقتدار سمیت مصر کی ''عظیم الشان تہذیب'' اور ''مثالی روایات'' کو بھی بہا لے جائے گا۔ ثانیاً اس فقرے سے اس کی بے چارگی بھی عیاں ہو رہی ہے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے وزراء اور امراء سے اس قرارداد کی منظوری کی درخواست کی۔ اس کی ضرورت اسے کیوں محسوس ہوئی؟ دراصل وہ دیکھ رہا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت سے ہر طبقے کے لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس تجویز پر تمام درباریوں کو اعتماد میں نہ لیا گیا تو ردِعمل کے طور پر کہیں سے کوئی بغاوت بھی جنم لے سکتی ہے۔

﴿اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴾ ''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔''

''دین'' سے مراد یہاں نظامِ حکومت ہے' اور فرعون کو اب سب سے بڑا اندیشہ یہی تھا کہ مصر کا اقتدارِ اعلیٰ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

فرعون کی مذکورہ قرارداد کی اطلاع حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچی تو آپؑ نے خود کو اللہ کی پناہ میں دینے کے عزم کا اظہار کیا:

آیت ۲۷ ﴿وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ ''اور موسیٰؑ نے کہا کہ میں پناہ پکڑتا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر اُس متکبر شخص کے مقابلے میں' جو یومِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔''

آیات ۲۸ تا ۳۷

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۚ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاۗءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَاۗءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ

مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ ۝ وَيٰقَوۡمِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ يَوۡمَ التَّنَادِ ۝ يَوۡمَ تُوَلُّوۡنَ مُدۡبِرِيۡنَ ۚ مَا لَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ عَاصِمٍ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ۝ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ يُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَيِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمۡ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلۡتُمۡ لَنۡ يَّبۡعَثَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ رَسُوۡلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ مُّرۡتَابُ ۚ الَّذِيۡنَ يُجَادِلُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ سُلۡطٰنٍ اَتٰىهُمۡ ؕ كَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰهِ وَعِنۡدَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلۡبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ يٰهَامٰنُ ابۡنِ لِىۡ صَرۡحًا لَّعَلِّىۡۤ اَبۡلُغُ الۡاَسۡبَابَ ۝ اَسۡبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوۡسٰى وَاِنِّىۡ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَا كَيۡدُ فِرۡعَوۡنَ اِلَّا فِىۡ تَبَابٍ ۚ

آیت ۲۸ ﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ۚ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَكۡتُمُ اِيۡمَانَهٗۤ﴾ ’’اور آلِ فرعون میں سے ایک مؤمن مرد نے‘ جو ابھی تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا‘ کہا:‘‘

اس مرحلے پر اس مردِ مؤمن نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کلمۂ حق زبان پر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بھرے دربار میں اس مطلق العنان فرعون کے سامنے کھڑے ہو کر ’’حق گوئی و بے باکی‘‘ کی ایسی مثال قائم کی کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے گویا ’’موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے!‘‘ اور پھر ان موتیوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے جاں نثارانِ حق کی آنکھوں کی طراوت کے لیے صفحاتِ قرآن کی زینت بنا دیا۔ چنانچہ فرعون نے جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی قرارداد پیش کی‘ یہ مردِ مؤمن فوراً بول اٹھا اور اس نے فرعون اور تمام اہلِ دربار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

﴿اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ يَّقُوۡلَ رَبِّىَ اللّٰهُ﴾ ’’کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو محض اس لیے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے!‘‘

کیا کسی شخص کا اللہ کو رب ماننا تمہارے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی پاداش میں تم اس کی جان کے درپے ہو گئے ہو؟

ایک مرتبہ جب مشرکینِ مکّہ نے حضور ﷺ کی سرِ عام ہجو کی اور آپؐ پر حملہ آور ہوئے تو

اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیچ میں آ گئے اور انہوںؓ نے مشرکینِ مکّہ کو مخاطب کر کے یہی الفاظ دہرائے تھے: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (۱) ’’کیا تم لوگ ایک شخص (محمد ﷺ) کی جان کے درپے صرف اس لیے ہو رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے!‘‘

﴿وَقَدۡ جَآءَكُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ﴾ ’’حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہے۔‘‘

﴿وَاِنۡ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيۡهِ كَذِبُهٗ ۚ﴾ ’’اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اُسی پر آئے گا۔‘‘

﴿وَاِنۡ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبۡكُمۡ بَعۡضُ الَّذِىۡ يَعِدُكُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر وہ سچا ہوا تو تمہیں وہ بعض باتیں پہنچ کر رہیں گی جن کے بارے میں وہ تمہیں وعید سنا رہا ہے۔‘‘

ایسی صورت میں تم پر عذابِ الٰہی کی مار پڑے گی اور تم تباہ و برباد کر دیے جاؤ گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ مَنۡ هُوَ مُسۡرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ راہ یاب نہیں کرتا اس کو جو حد سے بڑھنے والا‘ بہت جھوٹا ہو۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿يٰقَوۡمِ لَكُمُ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ظٰهِرِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ﴾ ’’اے میری قوم کے لوگو! آج تو تمہارے ہاتھ میں حکومت ہے اور تم ہر طرح سے زمین میں غالب ہو۔‘‘

آج تو تم ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک ہو اور پوری دنیا میں تمہاری طاقت کا ڈنکا بج رہا ہے۔

﴿فَمَنۡ يَّنۡصُرُنَا مِنۡۢ بَاۡسِ اللّٰهِ اِنۡ جَآءَنَا ؕ﴾ ’’لیکن اگر کہیں ہم پر اللہ کا عذاب آ گیا تو اس سے بچانے کے لیے ہماری مدد کون کرے گا؟‘‘

﴿قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِيۡكُمۡ اِلَّا مَاۤ اَرٰى﴾ ’’فرعون نے کہا: میں تو تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو مجھے نظر آ رہا ہے‘‘

مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر اب بھی موسیٰؑ کا قصہ پاک نہ کیا گیا تو پانی ہمارے سروں سے گزر جائے گا اور یہ مصر کے طول و عرض میں فساد برپا کر دے گا۔ اس طرح جو تباہی آئے گی وہ

(۱) صحيح البخاري‘ كتاب المناقب‘ باب قول النبي ﷺ ﴿لو كنت متخذا خليلا﴾ و كتاب تفسير القرآن‘ ح: ۳۶۷۸‘ ۴۸۱۵۔

ہمارا سب کچھ برباد کر کے رکھ دے گی۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں نے تو تمہارے سامنے اپنی وہی رائے پیش کی ہے جو مجھے مناسب نظر آتی ہے —— مردِ مؤمن کی کھری کھری باتوں کے جواب میں فرعون کا یہ معذرت خواہانہ ردِعمل حیران کن ہے۔ فرعون کی مطلق العنانی کا تصور ذہن میں رکھیے اور پھر اس مختصر سے جملے کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہوئی بے بسی اور بے چارگی ملاحظہ کیجیے۔

﴿وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۲۹﴾ ’’اور میں نہیں راہنمائی کر رہا تمہاری مگر کامیابی کے راستے کی طرف۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ﴾ ’’اور مردِ مؤمن نے (اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے) کہا: اے میری قوم کے لوگو!‘‘

﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۳۰﴾ ’’مجھے اندیشہ ہے تم پر ایسے دن کا جیسے دن پہلی قوموں پر آئے تھے۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ﴾ ’’جیسا کہ معاملہ ہوا تھا قومِ نوحؑ کا اور قومِ عاد اور قومِ ثمود اور ان کے بعد کی قوموں کا۔‘‘

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۳۱﴾ ’’اور اللہ تو اپنے بندوں پر کسی ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔‘‘

یہ تو خود بندے ہی ہیں جو رسولوں کی تکذیب اور اپنی کوتاہیوں اور شرارتوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی کو دعوت دیتے ہیں‘ ورنہ اللہ عزوجل تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

آیت ۳۲ ﴿وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۳۲﴾ ’’اور اے میری قوم کے لوگو! مجھے اندیشہ ہے تم پر چیخ پکار کے دن کا۔‘‘

جس دن ہر طرف فریاد و فغاں اور چیخ و پکار مچی ہوگی اور لوگ ایک دوسرے کو پکار رہے ہوں گے۔

آیت ۳۳ ﴿يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ﴾ ’’جس دن تم پیٹھ موڑ کر بھاگو گے‘ لیکن اللہ کی پکڑ سے تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔‘‘

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۳۳﴾ ’’اور جسے اللہ ہی گمراہ کر دے پھر اسے

ہدایت دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ’’اور (دیکھو!) اس سے پہلے تمہارے پاس یوسفؑ آئے تھے واضح نشانیاں لے کر‘‘

تمہارے اسی ملک مصر میں اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام بھی اللہ کے نبی کی حیثیت سے تمہارے آباء و اجداد کے پاس آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تاویل الاحادیث کا علم عطا کیا تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو اس کے خواب کی تعبیر بتلا کر آنے والی قحط سالی کے تدارک کی تدبیر بھی بتائی تھی اور اس طرح اس ملک کو تباہی سے بچایا تھا۔ اس کے باوجود تمہاری قوم نے نہ تو ان کی نصیحتوں پر کان دھرا اور نہ ہی انہیں اللہ کا نبی مانا۔ اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے درمیان بنی اسرائیل میں کوئی اور نبی نہیں آئے۔ اگر حضرت یوسفؑ کے بعد کوئی اور نبی بھی آئے ہوتے تو مؤمنِ آلِ فرعون اُن کا بھی ذکر کرتے۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چودہ سو سال کے دوران بنی اسرائیل میں بغیر کسی وقفے کے مسلسل نبوت رہی۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ نکتہ بھی مدنظر رہے کہ آپؑ رسول نہیں‘ صرف نبی تھے۔

﴿فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاۗءَكُمْ بِهٖ ۭ﴾ ’’لیکن تم شکوک و شبہات میں ہی پڑے رہے ان تعلیمات کے بارے میں جو وہ تمہارے پاس لے کر آئے تھے۔‘‘

﴿حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ﴾ ’’یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم نے کہا کہ اب ان کے بعد اللہ کسی اور کو رسول بنا کر نہیں بھیجے گا۔‘‘

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں تو انہیں اللہ کا پیغمبر تسلیم نہ کیا مگر فوت ہونے پر ان کا ذکر پیغمبر کے طور پر ہی کیا۔

﴿كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ۳۴﴾ ’’اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو حد سے بڑھنے والے اور شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والے ہوں۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ﴾ ’’جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو۔‘‘

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ﴾ ’’بڑی بیزاری کی بات ہے یہ اللہ

کے نزدیک بھی اور اہلِ ایمان کے نزدیک بھی۔‘‘

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾﴾ ’’اسی طرح اللہ مہر لگا دیا کرتا ہے ہر اُس شخص کے دل پر جو متکبّر اور سرکش ہو۔‘‘

اللہ کے اس فیصلے کے بعد پھر ایسے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔

مؤمنِ آلِ فرعون کی اس تقریر کو پڑھتے ہوئے فرعون کے دربار کا نقشہ ذہن میں لائیے اور در و دیوار کے درمیان سے اُبھرنے والی اس تصویر کو غور سے دیکھئے! فرعون نظریں زمین پر گاڑے بت بنا بیٹھا ہے۔ اس کے دائیں بائیں سب کے سب درباری مبہوت ہو چکے ہیں‘ پورے دربار میں سناٹے کا عالَم ہے۔ فضا میں صرف ایک آواز گونج رہی ہے اور وہ ہے حق کی آواز! مردِ مؤمن پُرجلال انداز میں اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے ہے۔ تقریر نہایت مؤثر اور مربوط ہے۔ اس میں عقلی دلائل بھی ہیں اور تاریخی شواہد بھی۔ دعوت کا انداز بھی ہے اور عبرت کا سامان بھی۔ ماحول پر گہری سنجیدگی طاری ہو چکی ہے۔ اس صورتِ حال میں فرعون کرے تو کیا کرے۔ نہ تو اسے چپ رہنے کا یارا ہے اور نہ بولنے کا حوصلہ۔ اندیشہ ہائے دور دراز کے جھرمٹ میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ’’فرعون‘‘ ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ اس کیفیت سے باہر آتا بھی ہے تو مردِ مؤمن کو جواب دینے کے بجائے اپنے وزیر سے مخاطب ہونا مناسب سمجھتا ہے:

آیت ۳۶ ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾﴾

’’اور فرعون نے کہا: اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنواؤ تاکہ میں پہنچ جاؤں راستوں تک۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى﴾ ’’یعنی آسمان کے راستوں تک‘ پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے الٰہ کو‘‘

یہ موسیٰ جس الٰہ کا ذکر کرتا ہے میں اس تک پہنچ کر خود اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔

﴿وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ﴾ ’’اور میرا گمان تو یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔‘‘

﴿وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ﴾ ’’اور اس طرح فرعون کے لیے اس کا بُرا عمل بھی مزیّن کر دیا گیا‘‘

یعنی فرعون کی نگاہوں میں اُس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی۔

﴿وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿٣٧﴾﴾ ’’اور اسے روک دیا گیا سیدھی راہ سے۔ اور فرعون کی یہ چال نہیں تھی مگر تباہ ہونے کے لیے۔‘‘

فرعون کی بے بسی کی ایک تصویر تو ہم قبل ازیں آیت ۲۹ میں دیکھ آئے ہیں: ﴿مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿٢٩﴾﴾ کہ دیکھو بھئی! یہ تو میری رائے ہے‘ مجھے جو بات صحیح محسوس ہوئی وہ میں نے آپ لوگوں کے سامنے رکھ دی۔ اب آیت زیر مطالعہ میں جو منظر دکھایا گیا ہے اس میں وہ پہلے سے بھی زیادہ بے بس نظر آ رہا ہے۔ یہ جملے بولتے ہوئے نہ تو اس نے مردِ مؤمن کی کسی بات کا جواب دیا اور نہ ہی وہ اس سے نظریں ملا سکا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے بات کی بھی تو اپنے وزیر سے کی اور بات بھی نہایت بے تکی اور لایعنی کی! کہ مجھے کوئی اونچا سا مینار بنا دو تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے معبود کو دیکھ سکوں! واہ رے بادشاہ سلامت واہ! اسے کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے!

اللہ تعالیٰ کے وجود کے خلاف ایسی ہی ایک ’’پختہ دلیل‘‘ موجودہ دور کے لال بجھکڑوں کو بھی سوجھی تھی جب انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو چاند تک بھی ہو آئے ہیں‘ ہمیں تو کہیں کوئی خدا نظر نہیں آیا۔ مردِ مؤمن نے بہرحال فرعون کی اس فضول اور بے محل بات کو نظر انداز کر کے کمال سنجیدگی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا:

آیات ۳۸ تا ۵۰

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿٣٨﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا
يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى
النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ
بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿٤٢﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ
لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ

الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ
اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا
وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ وَاِذْ يَتَحَاۗجُّوْنَ
فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ
اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا
رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

آیت ۳۸ ﴿وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور کہا اُس مؤمن نے کہ اے میری قوم کے لوگو! تم میری پیروی کرو' میں تمہاری راہنمائی کروں گا نیکی کے راستے پر۔''

یہ گویا فرعون کی اس بات کا جواب ہے جو اُس نے کہا تھا: ﴿وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور میں تمہاری راہنمائی نہیں کر رہا مگر کامیابی کے راستے کی طرف''۔ جواب میں مردِ مؤمن نے فرعون ہی کے الفاظ دہراتے ہوئے اہلِ دربار کو مخاطب کیا ہے کہ اگر کوئی ''سبیل الرشاد'' کی بات کرتا ہے تو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ''سبیل الرشاد'' کیا ہے۔ تم میری بات مانو' میرے پیچھے آؤ' میں تمہاری راہنمائی کرتا ہوں کہ بھلائی اور کامیابی کیا ہوتی ہے اور کون سا راستہ رشد و ہدایت اور فلاح و کامیابی کی طرف جاتا ہے۔

آیت ۳۹ ﴿يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو بس (چند روزہ) برتنے کا سامان ہے اور مستقل رہنے کی جگہ تو آخرت ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ﴾ ''جس نے کوئی بدی کمائی ہوگی تو اُسے بدلہ ملے گا اُسی کے مانند۔''

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی نیک عمل کرے گا' چاہے مرد ہو یا عورت' لیکن ہو وہ مؤمن''

﴿فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾﴾ ''تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے' وہاں انہیں رزق ملے گا بغیر حساب کے۔''

آیت ۴۱ ﴿وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور اے میری قوم کے لوگو! مجھے کیا ہے کہ میں تمہیں پکار رہا ہوں نجات کی طرف اور تم مجھے دعوت دے رہے ہو آگ کی!''

تم اللہ کے رسولؐ کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو اور مجھ سے چاہتے ہو کہ میں بھی اس گناہ میں تمہارے ساتھ شریک ہو کر جہنم کا مستحق بن جاؤں' جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب میرے ساتھ آؤ' میرا راستہ اپناؤ' اللہ کے حضور توبہ کرو اور جہنم سے نجات پا کر جنت میں چلے جاؤ۔

آیت ۴۲ ﴿تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ''تم مجھے دعوت دے رہے ہو اس بات کی کہ میں اللہ کا کفر کروں اور شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ جس کا مجھے کوئی علم نہیں''

﴿وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾﴾ ''اور میں تمہیں بلا رہا ہوں اُس ذات کی طرف جو زبردست ہے' بخشش کرنے والا ہے۔''

آیت ۴۳ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ﴾ ''بلاشبہ جن (معبودوں) کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو' ان کے لیے کوئی دعوت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں''

یہ سب تمہارے خود ساختہ معبود ہیں۔ نہ تو دنیا میں کہیں ان کی رسائی ہے اور نہ ہی آخرت میں انہیں کوئی اختیار ہے۔

﴿وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور یہ کہ ہم سب کو لوٹنا تو اللہ ہی کی طرف ہے''

یاد رکھو! خواہی نخواہی ہمیں ایک دن حاضر تو اللہ ہی کے حضور ہونا ہے۔

﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور جو حد سے گزرنے والے ہیں

وہی جہنمی ہیں۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ﴾ ’’تو عنقریب تم یاد کرو گے (یہ باتیں) جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔‘‘

میں جانتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کو نہیں مانو گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم موسیٰؑ اور اس کی قوم کے خلاف اپنی ساری چالیں چل کر رہو گے۔ مگر یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو یقیناً تم اپنی تباہی اور بربادی کو دعوت دو گے۔ بہرحال میری یہ باتیں تمہیں اس وقت ضرور یاد آئیں گی جب تمہارا بھیانک انجام تمہارے سامنے آن کھڑا ہوگا۔

﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور میں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔‘‘

یہ مردِ مؤمن کی تقریر کے اختتامی الفاظ ہیں۔ اس جملے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ فرعون کے دربار میں کلمۂ حق بلند کرنے کے بعد مردِ مؤمن ذہنی طور پر کسی بھی سزا کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس ’’گستاخی‘‘ کے بعد انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس خوبصورت جملے پر کیا۔ سورۂ یٰسٓ میں بھی ایک مردِ مؤمن کی ’’حق گوئی و بے باکی‘‘ کا ذکر ہوا ہے‘ جس نے اپنی قوم کو رسولوں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنے ایمان کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا تھا۔ اس ’’اعلانِ بغاوت‘‘ کے نتیجے میں اس کو اسی لمحے شہید کر دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت اسے جنت میں داخل فرما دیا تھا۔ قرآن حکیم میں اس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷﴾ (یٰسٓ) ’’اس نے کہا کاش! میری قوم کو معلوم ہو جاتا میرے رب نے جس طرح میری مغفرت فرمائی ہے اور جس طرح مجھے باعزت لوگوں میں شامل کر لیا ہے!‘‘ مؤمنِ آلِ فرعون نے بھی اپنی شہادت کے امکان کو دیکھتے ہوئے کمال اطمینان سے اپنا معاملہ اللہ کو سونپ دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴﴾ ’’اللہ یقیناً اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔‘‘

اسے یقین تھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حالات سے خوب واقف ہے‘ وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔ وہ جسے چاہے ظلم و زیادتی کا شکار ہونے سے بچا سکتا ہے۔

آیت ۴۵ ﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا﴾ ’’تو بچا لیا اللہ نے اُس کو ان کی چالوں کی برائیوں سے‘‘

یہاں پر ہٗ کی ضمیر کا مرجع مؤمنِ آلِ فرعون بھی ہو سکتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد مؤمنِ آلِ فرعون ہے کہ اللہ نے اسے فرعون کے انتقام کا نشانہ بننے سے بچا لیا‘ لیکن اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں۔ چونکہ اس بات کا آغاز فرعون کی اس قرارداد سے ہوا تھا جو اس نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کی اجازت کے لیے اپنے درباریوں کے سامنے پیش کی تھی۔ اس لیے زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس پوری تفصیل کے اختتام پر آیت زیر مطالعہ میں فرعون کے مذکورہ منصوبے کی ناکامی پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ مؤمنِ آلِ فرعون کی اس تقریر کے بعد دربار کا ماحول ایسا نہ رہا کہ اس میں حضرت موسیٰؑ کے قتل کی قرارداد پاس ہو سکتی۔ چنانچہ فرعون اور اس کے درباری اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝۴۵﴾ ’’اور گھیر لیا آلِ فرعون کو بدترین عذاب نے۔‘‘

آیت ۴۶ ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ﴾ ’’آگ ہے جس پر وہ پیش کیے جاتے ہیں صبح و شام۔‘‘

یہ قرآن مجید کی دوسری آیت ہے جس سے عذابِ قبر سے متعلق دلیل ملتی ہے (نیز ملاحظہ ہو: سورۃ الفرقان کی آیت ۶۹ کی تشریح۔)

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶﴾ ’’اور جس دن قیامت قائم ہوگی (اُس دن کہہ دیا جائے گا کہ) داخل کر دو فرعون کی قوم کو شدید ترین عذاب میں۔‘‘

اس آیت کے مفہوم کے مطابق آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں تو قیامِ قیامت کے بعد داخل کیا جائے گا‘ لیکن اس سے پہلے قبر کی زندگی کے دوران صبح و شام انہیں آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے —— عذابِ قبر کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کے فرمودات بہت واضح ہیں۔ آپؐ کا فرمان ہے: ((اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ))(۱) ’’قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا‘‘۔ منکرینِ حدیث البتہ عذابِ قبر کی نفی کرتے ہیں۔ دراصل قبر کا معاملہ ایک دوسرے

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب صفة القيامة والرقائق والورع‘ ح: ۲۴۶۰۔

جہان کا معاملہ ہے جو عالمِ غیب ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ قبر سے مراد وہ مخصوص گڑھا نہیں جہاں میت کو دفن کیا جاتا ہے' بلکہ اس سے مراد عالم برزخ ہے۔ سورۃ المُطفّفین میں عالم برزخ کی دو کیفیات عِلّیّین اور سِجّین کا ذکر ملتا ہے۔ اس عالم میں انسان نیم شعوری کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی خوش قسمت ''عِلّیّین'' میں ہے تو وہاں جنت کی کھڑکی کھلی ہوتی ہے اور وہ جنت کی ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ''سِجّین'' میں جہنم کی کھڑکی میں سے آگ کی لپٹ آ رہی ہوتی ہے۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا﴾ ''اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ بڑے بننے والوں سے کہیں گے:''

﴿اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾﴾ ''ہم تو تمہاری پیروی کرتے تھے' تو کیا تم لوگ ہم سے آگ کے عذاب کا کوئی حصہ کم کروا سکتے ہو؟''

دنیا میں تو تمہارا ہر جگہ حکم چلتا تھا۔ تو اگر یہاں پر بھی تمہارا کچھ اختیار ہے تو ہمارے عذاب میں کچھ کمی کروا دو۔ آخر ہم تمہاری پیروی کر کے ہی اس حال کو پہنچے ہیں۔

آیت ۴۸ ﴿قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ ۙ﴾ ''وہ بڑے بننے والے کہیں گے کہ ہم سبھی اس کے اندر پڑے ہوئے ہیں''

یعنی ابوجہل اور عتبہ بن ابی معیط جیسے بڑے بڑے سردار اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں سے یوں معذرت کریں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾﴾ ''اللہ نے تو اپنے بندوں کے مابین فیصلہ کر دیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری فیصلہ ہو چکا ہے اور ہم تم سب چونکہ مجرم تھے اس لیے اس عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَۃِ جَہَنَّمَ ادۡعُوۡا رَبَّکُمۡ یُخَفِّفۡ عَنَّا یَوۡمًا مِّنَ الۡعَذَابِ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور کہیں گے وہ لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنم کے داروغوں (فرشتوں) سے' آپ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہم سے بس ایک دن ہی عذاب

میں تخفیف کر دے۔''

آیت ۵۰ ﴿قَالُوۡۤا اَوَ لَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ﴾ ''وہ جواب میں کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس رسولؑ نہیں آتے رہے تھے واضح نشانیوں (اور واضح تعلیمات) کے ساتھ؟''

﴿قَالُوۡا بَلٰی ؕ﴾ ''وہ کہیں گے: ہاں (آئے تو تھے)!''

﴿قَالُوۡا فَادۡعُوۡا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾﴾ ''وہ کہیں گے: تو اب تم خود ہی پکارو! اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر بھٹک کر رہ جانے والی۔''

دنیا کی زندگی میں جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی تھی آج ان کی دعا بالکل صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ ان لوگوں کی دعا کا نہ کوئی اثر ہوگا اور نہ ہی اس کی کہیں شنوائی ہوگی۔ بالکل یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں تو مانگتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنی حرام خوری بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ باطل کی چاکری بھی کیے جا رہے ہیں' طاغوت کے حمایتی بھی بنے ہوئے ہیں اور اپنی سوچ اور فکر کو باطل طور طریقوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے نت نئی راہیں بھی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان کی وفاداری اور دوستی تو شیطان اور اس کے چیلوں سے ہوتی ہے مگر دعا اللہ سے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ حدیث پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو بڑا طویل سفر کر کے (حج یا عمرہ کے لیے) آتا ہے۔ اس کے کپڑے بھی میلے ہو چکے ہیں اور بال بھی غبار آلودہ ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر ''یارب! یارب!'' پکارتا ہے۔ لیکن اُس کا کھانا بھی حرام کا ہے' اُس کا پینا بھی حرام کا ہے' اُس نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں وہ بھی حرام کمائی کے ہیں' اور اس کے جسم نے حرام غذا سے نشوونما پائی ہے ـــــ تو اُس کی دعا کیونکر قبول ہو؟ ((فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ!)) (۱)

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہم نے دیکھا کہ پاکستان کی نصرت کے لیے حرمین شریفین میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی تھی اور گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی تھیں' مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے کرتوتوں کی وجہ سے اپنے گھر کے اندر مانگی گئی ان دعاؤں کو بھی ٹھکرا دیا اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

لفظ ''کافر'' کو اس کے وسیع مفہوم کے تناظر میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس کی زد کہاں کہاں

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا۔

پڑتی ہے۔اس کا مصداق قانونی کفار کے علاوہ وہ لوگ بھی ٹھہرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔اس حوالے سے سورۂ آل عمران کی آیت ۹۷ کے آخر میں سنائی گئی وعید بہت واضح ہے۔مذکورہ آیت میں حج کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا:﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹۷﴾ ''اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے''۔یعنی جس نے صاحب استطاعت ہو کر بھی حج ادا نہیں کیا اس نے گویا کفر کیا۔اسی طرح تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں حضور ﷺ کا بہت مشہور فرمان ہے:((مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا))(۱) ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے علانیہ کفر کیا۔''

پس ایک کفر تو وہ ہے جس سے ایک مسلمان باقاعدہ مرتد ہو کر سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے اور ایک کفر یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کسی خاص حکم کی نافرمانی سے سرزد ہوتا ہے اور جس کو کسی صاحب نظر نے ''جودم غافل سودم کافر'' کا عنوان دیا ہے۔اس زاویے سے دیکھا جائے تو آج پوری دنیا کے مسلمان اس کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں۔آج دنیا بھر میں مسلمانوں کا کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو' جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان تو اس بارے میں یہ ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴﴾ (المائدۃ) ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں''۔چنانچہ ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ اس حوالے سے آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہم جس ملک کے شہری ہیں کیا وہاں شریعت اسلامی کی حکمرانی ہے؟ کیا ہمارے دیوانی و فوجداری معاملات قرآن کے قانون کے مطابق طے پا رہے ہیں؟ کیا ہمارا نظامِ معیشت اللہ کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو کیا ہم سورۃ المائدۃ کی مذکورہ آیت کے مصداق نہیں بن چکے ہیں۔

❁❁❁

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی: ۳/ ۳۴۳۔ الترغیب والترھیب للمنذری: ۱/ ۲۶۱۔ مجمع الزوائد للھیثمی: ۱/ ۳۰۰۔ الجامع الصغیر للسیوطی' ح: ۸۵۸۷۔ عن انس بن مالک ؓ۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۱۵)

خاندانی زندگی کے بنیادی اصول

شجاع الدین شیخ ☆

آج ہم سورۃ التحریم کی روشنی میں ''خاندانی زندگی کے بنیادی اصول'' سمجھنے کی کوشش کریں گے۔اس سورت کی آیات ۱ تا ۵ شوہر اور بیوی کے لیے ہدایات پر مشتمل ہیں' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ باہمی محبت' الفت' اعتماد اور حسنِ ظن میں تجاوز نہ کریں کہ اللہ ربّ العزت کی حدود پامال ہونا شروع ہو جائیں۔آیات ۶ تا ۹ میں سربراہِ خاندان کی ذمہ داریوں یعنی کفالت اور دینی و اخلاقی راہنمائی اور تربیت کا بیان ہے۔آیات ۱۰ تا ۱۲ میں بیوی کے علیحدہ تشخص کا ذکر ہے اور یہ باور کرایا گیا ہے کہ اگرچہ گھر گرہستی کے نظام کو چلانے کے لیے بیوی کو شوہر کے تابع رکھا گیا ہے' مگر بیوی کا اپنا علیحدہ تشخص بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن شوہر اور بیوی اپنے اپنے طور پر جواب دہ ہوں گے۔

بیوی کی خوشی کے لیے حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت

پہلی آیت میں ارشاد ہوا:﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱﴾ ''اے نبی (ﷺ!) آپ کیوں ترک کرتے ہیں اُس شے کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جائز کی ہے؟ کیا آپ اس سے اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا' مہربان ہے''۔ایک واقعہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آیا جس کے تناظر میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اور اس کے ذیل میں اُمت کو خاندانی زندگی کے حوالے سے راہنمائی دی جا رہی ہے۔روایات میں نبی اکرم ﷺ کا اپنی بعض ازواج کے احساسات و جذبات کی خاطر ایک قسم کے شہد کا استعمال ترک کر دینے کا ذکر آتا ہے۔واقعات

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت' تنظیم اسلامی

دو نقل کیے گئے ہیں‘ لیکن ہم ایک ہی واقعے کے تناظر میں تشریح پیش کریں گے۔

یہ مدنی زندگی کا واقعہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ عصر کے بعد اپنی ہر زوجہ محترمہ کے حجرے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ ایک زوجہ محترمہؓ اس دوران آپ ﷺ کو ایک خاص شہد پیش کرتی تھیں تو دو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو محسوس ہوا کہ وہاں وقت زیادہ لگ رہا ہے اور ہمارے ہاں وقت کم دیا جا رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے احساسات و جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے ارادہ فرمایا کہ آئندہ میں اس شہد کو استعمال نہیں کروں گا۔ بس اتنی سی بات ہوئی‘ لیکن اس کی بڑی اہمیت تھی‘ کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ آپ ﷺ کے اُمتی بھی آپ ﷺ کی پیروی میں ایک حلال شے کا استعمال ترک کر دیں گے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو اپنی ازواج کی خوشنودی کے لیے ایک حلال شے کو چھوڑ دیا‘ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی اکرم ﷺ سے شدید محبت تھی‘ لہٰذا اندیشہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس شہد کو ترک کر دینے کی وجہ سے آپ ﷺ کی پیروی میں صحابہ کرامؓ بھی اس کے استعمال کو ترک کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آیات نازل فرما کر رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجہ دلائی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے کسی حرام شے کو حلال کر دینا تو ممکن نہ تھا‘ آپ ﷺ نے تو صرف حلال کو ترک کیا تھا تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ دوسری طرف اُمت کا حال یہ ہے کہ وہ تو حرام کو حلال کر بیٹھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ اس واقعہ کے حوالے سے اہلِ ایمان کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ بیویوں کی دلجوئی میں اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ شے کو حرام یا حرام کردہ شے کو حلال نہ کر لیں۔ اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ آج بیوی بچوں کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی جا رہی ہے۔

آیت کے آخر میں ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ کے الفاظ سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔

قسموں کا کفّارہ: نعمتِ خداوندی

آیت ۲ میں فرمایا گیا: ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲﴾ ’’تحقیق اللہ نے تم لوگوں کے لیے تمہاری قسموں کا کفّارہ مقرر کر دیا ہے‘ اور اللہ تمہارا کارساز ہے‘ اور وہ جاننے والا‘ حکمت والا ہے‘‘۔ تَحِلَّة کے معنی کھولنے کے ہیں

اور قسموں کو کھولنے سے مراد ان کو توڑ کر کفّارہ ادا کرنا ہے۔ اگر قسم کھانے کے بعد کسی وجہ سے قسم کو توڑنا پڑ جائے تو ہمیں کفّارہ ادا کرنا ہوگا اور قسم کے کفّارے کا بیان سورۃ المائدہ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ﴾ (آیت ۸۹) ’’پس اس کا کفّارہ دس محتاج لوگوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے‘ اور جس کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے۔‘‘

مَوْلٰىكُمْ‘ مولیٰ کے معنی حمایتی‘ پشت پناہ یا خیر خواہ ہے۔ یہاں فرمایا گیا کہ ’’اللہ تمہارا مولیٰ ہے‘‘ تو اس واقعہ کے ضمن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ایک قسم کھا کے مشکل میں پڑ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے کفّارہ بتا کر تمہیں مشکل سے نکال دیا۔

راز کی حفاظت لازم ہے!

آیت ۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ .....﴾ ’’اور یاد کرو جب نبی (ﷺ) نے اپنی ایک زوجہ سے ایک راز کی بات کہی تو اس نے وہ بات (دوسری کو) بتا دی اور اللہ نے اس سے نبی (ﷺ) کو آگاہ فرما دیا .....‘‘ اللہ تعالیٰ جب رسول اللہ ﷺ کو کوئی حکم فرماتا ہے تو اس میں اُمت کے لیے راہنمائی ہوتی ہے‘ کیونکہ آپ ﷺ کا اسوہ کامل ہے —— نبی اکرم ﷺ نے کوئی بات بطورِ راز ایک زوجہ مطہرہ کو بتائی‘ انہوں نے بے تکلفی کی وجہ سے دوسری زوجہ مطہرہ کو وہ بات بتا دی۔ یہاں کون سی زوجہ محترمہ ہیں جن کو راز بتایا گیا اور کون سی زوجہ محترمہ ہیں جن کو یہ راز کی بات بتا دی گئی‘ قرآن حکیم نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

اس حوالے سے ایک اصولی بات نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں خواتین کا تذکرہ غائب کے صیغے میں کیا گیا ہے اور کسی بھی خاتون کا نام نہیں لیا گیا۔ صرف بی بی مریم (سلام علیہا) کا نام لیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ‘ معاذ اللہ‘ شرکیہ عقائد کو منسوب کرنے کی کوشش کی گئی یا ان کے حوالے سے شرکیہ عقائد اختیار کیے گئے۔ یا یہود نے‘ معاذ اللہ‘ ان کی پاک دامنی پر الزامات لگائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر ان کی پاک دامنی کا اعلان فرمایا۔ لیکن اصول یہی ہے کہ قرآن حکیم میں خواتین کا تذکرہ غائب کے صیغے میں کیا جاتا ہے

اوراس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خواتین کے معاملے کو پردے میں رکھنا چاہتا ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بغیر نام لیے نبی ﷺ کو راز افشا ہونے پر مطلع فرما دیا۔ ازواجِ مطہرات اُمت کی مائیں ہیں اور مسلمان خواتین کے لیے نمونہ ہیں' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی عدم احتیاط اور اس خطا پر انہیں متوجہ فرمایا۔

یہاں امت کی خواتین کو تلقین کی جارہی ہے کہ شوہر کے راز کو راز ہی رکھنا چاہیے۔ اس گھرانے کا ذکر اس لیے کر دیا گیا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ''تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔ عورتوں کے لیے اسوۂ حسنہ کی تکمیل اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے ذریعے ہوتی ہے' لہٰذا ان کو توجہ دلائی گئی تاکہ وہ عورتوں کے لیے کامل نمونہ بن سکیں۔

اسی آیت میں آگے ارشاد ہوا: ﴿..... عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝﴾ ''.....تو نبی (ﷺ) نے ان زوجہ کو وہ بات کچھ تو بتائی اور کچھ نہ بتائی۔ تو جب ان کو بات بتائی تو وہ پوچھنے لگیں کہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس نے بتایا ہے جو جاننے والا اور باخبر ہے''۔ ﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ﴾ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کسی خطا پر بعض باتوں کو نظر انداز فرما دیا کرتے تھے۔ یہ نبی ﷺ کا اسوہ اپنے گھر والوں کے ساتھ تھا۔ اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے اتنا تو بتایا کہ تم نے راز کسی کو بتا دیا' لیکن کوئی نوک جھونک یا ڈانٹ ڈپٹ نہیں فرمائی۔

اس ضمن میں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کو قرآن حکیم کی کسی آیت کے ذریعے نہیں' بلکہ وحی خفی کے ذریعے راز فاش ہونے کی اطلاع دی گئی۔ گویا آپ ﷺ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوتی تھی۔ آیئے سمجھیں کہ وحی خفی کیا ہے؟ قرآن میں جو کچھ نازل ہوا اس کو ہم وحی جلی اور وحی متلو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کے علاوہ بھی رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی تھی جسے وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو مطلع فرما دیا' لیکن قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے کہ ''اے نبی ﷺ! آپ کا راز فاش ہو گیا ہے''۔ تو یہ انداز بھی بتا رہا ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی رسول اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوا کرتی تھی۔

ازواج کو رجوع الی اللہ کی دعوت

آیت ۴ میں فرمایا گیا: ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝﴾ ''اگر تم دونوں اللہ کے حضور توبہ کرو تو (یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی گئے ہیں' اور اگر تم نے نبی (ﷺ) کے مقابلے میں باہم اعانت کی تو بے شک ان کا حامی اللہ اور جبریلؑ اور نیک اہلِ ایمان ہیں' اور اس کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں''۔ جن دو ازواجِ مطہرات کا ذکر پچھلی آیت میں آیا تھا اب ان کے تعلق ہی سے مزید گفتگو آ رہی ہے اور ان کو رجوع الی اللہ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

صَغَتْ (صَغَا یَصْغُوْ وَیَصْغٰی) کے معنی جھکنا یا مائل ہونا ہے۔ قرآن کے کئی تراجم میں اس کا ترجمہ ''دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں'' کیا گیا ہے' جو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آیئے اس کی دلیل بھی سمجھ لیتے ہیں۔ صَغَا کے بعد اِلٰی کا صلہ آئے تو اس کے معنی ٹیڑھا ہونا ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا: ﴿وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ (آیت ۱۱۳) ''اور ٹیڑھے ہو جائیں دل ان لوگوں کے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے''۔ اس آیت میں اِلٰی کا صلہ آیا ہے اس لیے یہاں یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ انگریزی میں کسی verb کے ساتھ preposition add کرتے ہیں تو معنی بدلتے ہیں اور prepositon تبدیل کرتے چلے جائیں تو معنی بدلتے چلے جاتے ہیں۔ look after کا مطلب کچھ اور ہے' جبکہ look into کا مطلب کچھ اور۔ اسی طرح عربی میں صلہ کی تبدیلی سے معانی تبدیل ہوتے ہیں۔ چنانچہ صَغَتْ کے بعد اِلٰی کا صلہ نہ آئے تو اس کا مطلب مائل ہونا ہی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ معاملہ جب صحابہ کرامؓ اور ازواجِ مطہراتؓ کا ہو تو خصوصی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ازواجِ مطہرات کے مقامِ رفیع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے دونوں ازواج کو متوجہ فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ کا مددگار تو اللہ ہے اور پھر تمام فرشتے بالخصوص جبریلؑ اور تمام صالح اہلِ ایمان ہیں۔ یہاں مولیٰ کا لفظ اللہ کے لیے بھی آ رہا ہے اور دوست اور ساتھی ہونے کے اعتبار سے فرشتوں کے ساتھ ساتھ اہلِ ایمان کے لیے بھی آ رہا ہے۔

صفاتِ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن

آیت ۵ میں فرمایا گیا: ﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝﴾ ''عجب نہیں کہ نبی (ﷺ) تم کو طلاق دے دیں تو ان کا رب تمہارے بدلے ان کو تم سے بہتر ازواج دے دے جو فرمانبردار' ایمان والیاں' اطاعت شعار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گزار' ریاضت کرنے والیاں' شوہر آشنا اور کنواریاں ہوں''۔ اس آیت کے ضمن میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ کو طلاق نہیں دی اور دوسرا یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی صفات گنوائی ہیں۔ گویا اس آیت میں ازواجِ مطہرات کی عظمت کا بیان ہمارے سامنے آیا ہے اور یہ آیت ازواجِ مطہرات کے اعلیٰ سیرت و کردار کی دلیل پیش کرتی ہے۔

ازواجِ مطہرات کی ایک خاص صفت اُن کا اختیاری فقر اور دنیا سے بے رغبت ہونا ہے۔ سٰٓئِحٰتٍ روزہ رکھنے والیوں کو کہا جاتا ہے اور انہیں بھی جو دنیا سے بے رغبتی اختیار کریں۔ اس سے مراد ترکِ دنیا نہیں' بلکہ بہت کم پر گزارا کرنا اور سادہ زندگی بسر کرنا۔ خود نبی اکرم ﷺ نے اس کی بہترین مثالیں قائم کیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اگر اپنے سامنے کسی خاندان کو رول ماڈل رکھنا ہو تو وہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان ہے۔ اللہ ربّ العزت اس مقدس گھرانے کے مقدس افراد کی مقدس تعلیمات اور کردار ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اہل وعیال کی تربیت: آپ کی ذمہ داری

آیت ۶ میں ارشاد ہوا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا.....﴾ ''اے مؤمنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش جہنم سے بچاؤ.....'' خاندان کے ہر فرد کی ذمہ داری خود کو اور تمام گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچانا ہے۔ جیسے گھر کے کسی فرد کا ہاتھ اگر چولہے میں جل جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو گھر کا سربراہ ہے صرف وہی اس کے لیے بھاگ دوڑ کرے' بلکہ سب اس کام میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایک کو اپنی اور اپنے گھر والوں کی فکر کرنی ہے کہ جس طرح دنیا کی آگ سے بچنے اور بچانے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح جہنم

کی آگ سے بچنے اور بچانے کی فکر کریں۔ مَردوں بالخصوص سربراہِ خاندان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِهٖ)) (متفق علیہ) ''جان لو کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اس سے اس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں سوال ہوگا''۔ باپ سے اولاد کے بارے میں اور شوہر سے بیوی کے بارے میں سوال ہوگا۔ دنیا میں گرمی کے دوران پنکھے اور ائیر کنڈیشنر بھی لگاتے ہیں' بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے دوران یو پی ایس بھی لگاتے ہیں' جنریٹر بھی استعمال کرتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں تاکہ گرمی سے بچا جا سکے' تو جہنم کی آگ کے حوالے سے ہم کس قدر سنجیدہ ہیں' اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

سربراہِ خاندان شریعت پر عمل کر کے خود کو بھی جہنم کی آگ سے بچائے اور اہل خانہ کی بھی حکمت اور ثابت قدمی سے ایسی دینی و اخلاقی تربیت کرے کہ وہ بھی خلافِ شریعت کاموں سے اجتناب کرنے کی کوشش کریں۔ جس طرح سربراہِ خاندان اپنے افرادِ خانہ کی دنیا کی مادی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کرتا ہے' اسی طرح ان کی روحانی اور اُخروی ضروریات کا اہتمام کرنا اس کی ذمہ داری بنتی ہے۔ اہل خانہ اور خصوصاً اولاد کی تربیت انسان کے لیے بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ، إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ)) (صحیح مسلم) ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال ایسے ہیں کہ جن کا ثواب اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے: ایک صدقۂ جاریہ' دوسرا ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور تیسرا نیک اولاد جو اُس کے لیے دعا کرتی رہے''۔ اگر آج اولاد کی ایسی تربیت ہو رہی ہے کہ وہ نیک بنے تو کل یہی اولاد ہمارے لیے سب سے بڑا صدقۂ جاریہ ہوگی اور مرنے کے بعد بھی ہمارے لیے اجر و ثواب کا باعث بنے گی۔

گھر والوں کو اسلامی تعلیمات اور دینی فرائض کے جامع تصور سے مسلسل آگاہ کیا جائے تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے اور انفرادی و اجتماعی معاملات میں دین کے تقاضے کیا ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں سیکھیں گے تبھی تو عمل کر سکیں گے۔ رزقِ حلال پر قناعت اور شرعی پردے کے اہتمام کو خصوصی اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ ان دونوں کے حوالے سے

رسول اللہ ﷺ کے فرمان ملاحظہ ہوں: ''مالِ حرام سے پلا ہوا جسم جہنم کا زیادہ مستحق ہوتا ہے''۔ (صحیح مسلم) ''اگر حیا نکل جائے تو ایمان چلا جاتا ہے''۔ (جامع ترمذی) چنانچہ ان دونوں حوالوں سے ہمیں زیادہ حساس ہونے کی ضرورت ہے۔

اس آیت کے اگلے حصے میں فرمایا: ﴿..... وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ ''.....جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں' جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں' اللہ جو حکم انہیں دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور کرتے وہی ہیں جن کا انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔ گھر والوں کو دین پر لانے کی فکر نہ کرنے والے گویا انہیں جہنم کے تندخو اور سخت مزاج فرشتوں کے حوالے کر رہے ہیں جن کے ذمے اللہ تعالیٰ نے عذاب دینے کا کام لگایا ہے' اور فرشتے کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔

آیت میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جس آگ کا ایندھن پتھر ہوں گے اُس کی تندی و تیزی اور شدت کا کیا عالَم ہوگا۔ ان پتھروں سے مراد وہ بُت بھی ہیں جن کو دنیا میں پوجا جاتا تھا اور اب ان بُتوں کو بھی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ بُت مشرکین کی حسرت میں اضافہ کریں گے اور جہنم کی آگ کی حِدّت کو اور بھڑکائیں گے۔ اے اللہ! ہم سب کو آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔

تربیتِ اولاد سے روگردانی کفریہ روش ہے!

آیت ۷ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ''اے کافرو! آج بہانے مت بناؤ۔ تمہیں بدلہ دیا جائے گا اسی عمل کا جو تم کرتے رہے ہو''۔ کسی حکم کے بعد جب کفر کا ذکر ہو تو اس سے مراد اس حکم پر عمل نہ کرنا ہے' مثلاً سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴﴾ ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہی تو کافر ہیں''۔ گویا جو لوگ اللہ کے حکم کو مانتے ہوں لیکن انہیں نافذ نہ کرتے ہوں تو عملاً وہ کفر کر رہے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت سے پچھلی آیت میں اہل ایمان کو حکم دیا جا رہا تھا کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ تو اب اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اس کا اہتمام نہیں کیا

جا رہا تو عملاً یہ کافرانہ روش ہے۔ جو لوگ آیت ۶ میں وارد شدہ ہدایت پر عمل نہ کریں وہ گویا عملی اعتبار سے کافر ہیں' خواہ قانونی اعتبار سے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

سچی توبہ اور نورِ ایمان کی اہمیت

آیت ۸ میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ﴾ ''اے مؤمنو! اللہ کے حضور توبہ کرو' سچی توبہ۔ امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تمہیں داخل کر دے گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں''۔ تَوْبَةً نَّصُوْحًا سے مراد ہے خالص اور سچی توبہ۔ علماء نے سچی توبہ کی شرائط کچھ اس طور پر نقل فرمائی ہیں: (۱) گناہوں پر حقیقی ندامت اور افسوس ہو۔ (۲) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ (۳) گناہ کو عملاً ترک کر دیا جائے' اور (۴) کسی کے ساتھ زیادتی کی صورت میں اس کا حق لوٹا دیا جائے یا اُس سے معاف کرایا جائے۔

جس توبہ کا اوپر ذکر آیا ہے یہ فرد کی انفرادی توبہ ہے' جبکہ اجتماعی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی توبہ ضروری ہے۔ ہمارے ملک کے حالات کے تناظر میں جب تک پوری قوم اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ نہ کرے' حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ اصل اجتماعی توبہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اللہ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کا دین قائم کریں گے۔ چنانچہ اس عہد کو پورا کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج یہاں سود کے دھندے بھی چلتے ہیں' بے حیائی کا طوفان بھی آیا ہوا ہے اور قرآن و حدیث کے خلاف قانون سازی بھی ہو رہی ہے۔ ہمیں ان تمام گناہوں کو بھی چھوڑنا ہوگا اور اللہ کے دین کو بھی یہاں نافذ کرنا ہوگا۔ یہ اجتماعی سطح پر سچی توبہ کا طریقہ ہے۔ اللہ ربّ العزت ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا گیا: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ﴾ ''اُس دن اللہ رسوا نہیں کرے گا نبی (ﷺ) کو اور اُن لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے''۔ روزِ قیامت جب اعمال کے ساتھ لوگوں کی نیتیں بھی ظاہر ہو رہی ہوں گی تو دنیا میں بڑی جاہ و حشمت رکھنے والے اور بظاہر بڑے نیک اعمال کرنے والے بھی رسوا نظر آئیں گے۔

اصل مسئلہ آخرت کا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگوں کا رعب و دبدبہ ہوتا ہے۔ یہ تو کل پتا چلے گا کہ کون کیا ہے۔ اصل میں باطن کا اظہار تو آخرت میں ہوگا تو پتا چل جائے گا کہ کون دراصل اللہ والا تھا اور کس نے نیکی کا جھوٹ موٹ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ گناہوں میں پڑا رہا درآنحالیکہ دنیا میں لوگ اسے نیک اور پارسا سمجھتے رہے۔ البتہ نبی اکرم ﷺ اور مخلص اہلِ ایمان اُس روز سرخرو ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں شامل فرمائے۔

زیرمطالعہ آیت کے آخری حصے میں فرمایا: ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٨ ﴾ ''ان کا نور ان کے آگے اور داہنی طرف روشنی کرتا ہوا چل رہا ہوگا اور وہ التجا کریں گے: اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارے نور کو پورا فرما دے اور ہمیں معاف فرما' بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔ اہل ایمان کے سامنے ان کے ایمانِ حقیقی کا نور ہوگا جس کا تعلق قلب سے ہوتا ہے' جب کہ ان کے داہنی طرف ان کے اعمالِ صالحہ کا نور ہوگا' کیونکہ نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں ہوگا۔ کل پُل صراط سے گزرنا ہوگا جہاں تاریکی ہوگی' لہٰذا آج دنیا میں نور جمع کرنے کا موقع ہے۔ دل میں ایمان ہو تو یہ روشنی سامنے ہوگی اور اگر دنیا میں اعمالِ صالحہ کیے ہوں گے تو ان اعمال کا نور داہنی طرف ہوگا۔ گویا ہر طرف نور ہی نور ہوگا۔ ایمان اور عمل کا نور کل جب بندے کو میسر آئے گا تو وہ پُل صراط سے گزر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آج اس نور کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینے سے عدن تک کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا اور کسی کا نور مدینے سے صنعا تک' جبکہ کسی کا اس سے کم' یہاں تک کہ کوئی مؤمن ایسا بھی ہوگا کہ جس کا نور اس کے قدموں سے آگے نہیں بڑھے گا۔ ایسے لوگ اپنے نور کے اضافے کے لیے دعا کریں گے اور ان گناہوں پر بخشش مانگیں گے جن کے اثرات نے ان کے نور کو دھندلا کر دیا ہوگا۔

بے جا نرمی سے پرہیز

آیت ۹ میں ارشاد ہوا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝٩ ﴾ ''اے نبی (ﷺ!) جہاد کیجیے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجیے' اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے' اور وہ بہت بری جگہ ہے''۔ نبی اکرم ﷺ کی

نرمی سے منافقین ناجائز فائدہ اٹھاتے اور منفی پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ منافقین کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سختی برتنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ زیرمطالعہ آیت کا سورت کے مضمون کے ساتھ تعلق یہ ہے کہ زیادہ محبت اور نرمی نقصان دہ ہوتی ہے۔ گھر میں بھی اگر محبت بہت زیادہ بڑھ جائے تو احکاماتِ شریعت پامال ہونے لگتے ہیں' لہٰذا نرمی اور سختی کا امتزاج ضروری ہے۔ یہاں لفظ جہاد' قتال کے معنی میں نہیں ہے' کیونکہ نبی کریم ﷺ نے منافقین کے ساتھ کبھی قتال نہیں فرمایا۔ اس کی ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ کبھی بعد کے حکمران اپنے حوالے سے جو لوگ ان کو پسند نہ کرتے ہوں' ان کو منافق قرار دے کر ان کے ساتھ جنگ نہ کر بیٹھیں۔ واللہ اعلم! یہاں جہاد سے مراد منافقین اور کفار کی سازشوں کا توڑ کرنا ہے۔

خواتین کا علیحدہ تشخص اور ان کا کردار

آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝١٠ ﴾ ''اللہ نے کافروں کے لیے حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) کی بیویوں کی مثال بیان فرمائی۔ دونوں ہمارے نیک بندوں کے گھروں میں تھیں اور دونوں نے ان سے خیانت کی' تو وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ داخل ہو جاؤ دوزخ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ''۔ یہ قرآن حکیم کا عجب مقام ہے۔ دو جلیل القدر پیغمبروں کی بیویوں کا بیان آ رہا ہے جو نافرمان تھیں۔ یہاں کافر خواتین کے لیے حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کی مثال بیان کی جاری ہے جو منافقین میں سے تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ خیانت کی یعنی ان کے رازوں کی حفاظت نہ کی' ان کا ساتھ نہ دیا' بلکہ نافرمان قوموں کے ساتھ لگی رہیں۔ روزِ قیامت یہ جلیل القدر پیغمبر انہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔ کسی پیغمبر کی بیوی اگر کفر پر ہے یا پیغمبر کی اطاعت گزار نہیں ہے تو کل قیامت کے دن پیغمبر اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

آیت ۱۱ میں ارشاد ہوا: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝١١ ﴾ ''اور اللہ نے مؤمنوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی جبکہ اُس

نے التجا کی: اے میرے رب! میرے لیے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنا دے' اور مجھے نجات عطا فرما فرعون اور اس کے (سیاہ) اعمال سے اور مجھے نجات عطا فرما ظالم قوم سے''۔ اہلِ ایمان خواتین کے لیے فرعون کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کی مثال بیان کی گئی ہے۔ محل اور اس کی تمام آسائشوں کے باوجود انہوں نے دعا کی کہ مجھے یہ سارا آرام اور سکون زہر لگتا ہے۔ فرعون نے ان کو شہید کروا دیا جب کہ وہ استقامت کا پہاڑ بنی رہیں۔ آج کی عورت کے لیے بی بی آسیہ رضی اللہ عنہا کے کردار اور ان کی دعا میں بہت بڑا پیغام ہے۔

آیت ۱۲ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور (اللہ نے مؤمنوں کے لیے دوسری مثال بیان فرمائی) عمران کی بیٹی مریم کی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو اللہ نے اس میں اپنی روح میں سے پھونک دیا اور اُس نے اپنے رب کے کلام اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھی''۔ آخری مثال حضرت مریم سلام علیہا کی ہے جن کی پرورش حضرت زکریا علیہ السلام نے کی۔ روایت میں آتا ہے کہ زکریاؑ ان کے خالو تھے۔ یہودیوں نے حضرت مریم پر بدکرداری کا الزام لگایا' لیکن قرآن حکیم نے آپ کی پاک دامنی کی گواہی دی۔ ان کے ہاں معجزانہ طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر والد کے پیدائش ہوئی۔ آپؑ نے تورات کی اور دیگر کلماتِ الٰہی کی' جو فرشتوں نے انسانی شکل میں آپ کے سامنے آ کر پیش کیے' تصدیق کی۔ آپ نے سخت آزمائش میں بھی جب بغیر مرد سے تعلق کے حاملہ ہو گئیں' اپنے رب کی فرمانبرداری جاری رکھی اور لوگوں کے لعن طعن کی کوئی پرواہ نہ کی۔

ماحول اور کردار کا باہمی تعلق اور چند ممکنہ صورتیں

سورۃ التحریم کی آخری تین آیات میں ہمارے سامنے کچھ کردار آتے ہیں جن کا ہم تجزیہ کرتے ہیں اور ماحول اور کردار کے حوالے سے ان کا تقابل آپ کے سامنے رکھتے ہیں:
(۱) اچھا ماحول اور بُرا کردار: حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں۔ (۲) بُرا ماحول اور اچھا کردار: فرعون کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا۔ (۳) اچھا ماحول اور اچھا کردار: حضرت زکریا علیہ السلام کی زیرکفالت حضرت مریم سلام علیہا۔ یہ گویا نُورٌ علٰی نُورٍ کا معاملہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ برے ماحول میں بھی اگر انسان خود حق پر رہنا چاہے تو اللہ تعالیٰ

توفیق عطا فرما دیتا ہے' اور اگر بہترین ماحول میسر ہو لیکن انسان کی اپنی نیت درست نہ ہو تو اس کو ہدایت نہیں ملتی۔

مندرجہ بالا تین کرداروں کے علاوہ ایک ممکنہ کردار اور بھی ہے اور وہ ہے: برا ماحول اور برا کردار۔ اس پر پورا اترتے ہیں ابولہب اور اس کی بیوی' اور یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضور ﷺ کی دشمنی' عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ یہ تاریخِ انسانی کا بدترین جوڑا ہے اور ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ کی مثال ہے' جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللہب میں لعنت فرمائی ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی پر استقامت عطا فرمائے' ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے اور عائلی زندگی کے اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین! ۞ ۞ ۞

خوبصورت مضامین کا گلدستہ

- مکاتیبِ نبوی ﷺ کی دریافت
- تحریکِ ختمِ نبوت کا تاریخی جائزہ
- موافقاتِ عمر اور اولیاتِ عمر رضی اللہ عنہ
- نماز کے آداب اور ہماری کوتاہیاں
- روزے کے فضائل و مسائل
- صدقہ فطر اور عید الفطر اور شوال
- حج بیت اللہ: شرائط اور ادائیگی کا طریقہ
- نومولود' میت اور مزدور کے حقوق
- تعلیمِ نسواں اور ہماری ذمہ داریاں
- اپریل فول اور ویلنٹائن کی بربادیاں

اور اس جیسے اکتیس علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ

ہدایت کی کرنیں

حافظ محمد زاہد

- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ بک پیپر
- اعلیٰ معیاری طباعت
- صفحات: 328
- قیمت: صرف 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

شائع کردہ

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 35869501-3

تزکیۂ نفس: کچھ گزارشات

محمد رشید عمر

تزکیۂ نفس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمتِ مُسلمہ کو عطا کردہ منصب شہادت علی الناس کا لازمی جزو ہے۔ شہادت علی الناس کا مطلب یہ ہے کہ افرادِ اُمت اپنے اندر قول اور عمل سے دین اسلام کی سچائی کے گواہ بن کر کھڑے ہو جائیں۔ گویا وہ اس نظام کے مثالی کارکن کی حیثیت سے دنیا کے سامنے موجود ہوں۔ ان کی زندگی نبی کریم ﷺ کی مثالی زندگی کا نمونہ ہو — نبی کریم ﷺ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک مثال تھے۔ بطور شوہر، سسر، داماد، باپ، چچا، بھتیجے، مربّی، داعی، منصف، تاجر، سپہ سالار، الغرض زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ﷺ چوٹی کی مثالی شخصیت تھے۔ یہی عکس افرادِ ملت میں نظر آنا چاہیے۔ یہ عکس نفس انسانی کی تہذیب سے بھی حاصل ہوسکتا ہے اور تہذیبِ نفس، تزکیۂ نفس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تزکیۂ نفس کی مزید اہمیت یہ بھی ہے کہ جس طرح ابدی فلاح کا تعلق ایمان سے ہے اسی طرح ایمان کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس بھی فلاح کا ذریعہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾﴾ (الاعلیٰ)

''یقیناً کامیاب ہوگیا وہ جس نے تزکیہ کیا، اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔''

مزید ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿٩﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿١٠﴾﴾ (الشمس)

''یقیناً کامیاب ہوگیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا۔ اور یقیناً ناکام ہوگیا وہ جس نے نفس کو (پاک کرنے کے تقاضوں کو) دبا دیا۔''

جس طرح ایمان کی دولت اللہ ربّ العزت کی نظرِ رحمت سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح تزکیہ نفس بھی اسی کی نظرِ رحمت سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا﴾ (النور:۲۱)

''اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک بھی تزکیہ حاصل نہ کرسکتا۔''

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا، وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا))(سنن النسائی)

''اے اللہ! میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما، اور اس کا تزکیہ فرما، تو ہی اس کا بہترین تزکیہ کرنے والا ہے۔''

آپ ﷺ نے تہذیبِ نفس کے لیے دو چیزوں (تزکیہ اور تقویٰ) کو جمع فرما دیا جن کا باہمی تعلق نفی اثبات کی صورت میں ہے۔ تزکیہ کا مطلب ہے دل کو غیر اللہ کی محبت سے پاک کرنا اور فسق و فجور سے چھٹکارے کے ساتھ ساتھ حرص، تکبّر، حسد، بغض، بخل اور منافقت جیسے رذائلِ اَخلاق سے خلاصی حاصل کرنا —— ع ''دل دریا سمندروں ڈونگے.....!'' ان رذائل سے جب دل خالی ہوں گے تو پھر کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جو اس سمندر کو بھر سکے۔ اور وہ صرف اور صرف اللہ کا تقویٰ ہے۔ اس خوبی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کی مدح فرمائی ہے۔ فرمایا:

﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ﴾ (الفتح:۲۶)

''اور اللہ تعالیٰ نے ان (کے دلوں) پر تقویٰ کی بات کو چسپاں کر دیا اور وہ (واقعی) اس کے حق دار اور اہل تھے۔''

مزید ارشادِ ربانی ہے:

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ (الحجرات:۳)

''یہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے چُن لیا ہے۔''

اب دیکھتے ہیں کہ کون سے اوصاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار کا حصہ بن گئے تھے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ''اہل التقویٰ'' کا لقب عطا فرمایا۔ پہلے نمبر پر اللہ اور رسول ﷺ کی محبت، آپ ﷺ کی عزت و وقار اور عظمت کا دل میں بیٹھ جانا ہے۔ اور یہ عزت و وقار اور عظمت کا جی جان سے اعتراف آپ ﷺ کے منصبِ رسالت کا تقاضا تھا جو فرمانِ الٰہی کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٩﴾﴾ (الفتح)

''(اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو شاہد' مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے' تاکہ (اے لوگو!) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کی تعظیم و توقیر کرو' اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔''

آپ ﷺ کی رسالت میں شاہد' مبشر اور نذیر کی صفات رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر' پھر اللہ کی عظمت کو اس طرح دل میں بٹھاؤ کہ اس کی تسبیح صبح و شام تمہاری زبان پر جاری رہے اور اسی طرح اس کے رسول ﷺ کی عظمت تمہارے دل میں اتنی گہری اُتر جائے کہ زبان پر درود و سلام جاری ہو جائے۔ مزید یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ کے فرمان کے سامنے اپنے اختیار سے دست بردار ہو جاؤ۔ نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادوں میں سب سے اہم بنیاد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عزت و ناموس اپنی جان' اولاد اور ماں باپ سے بڑھ کر عزیز ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ کے مقام و مرتبہ کی غایت درجہ میں تکریم اور اطاعت ہی بندۂ مؤمن کو تقویٰ کا مستحق بناتی ہے۔ حدیبیہ کے مقام پر مشرکینِ مکہ حمیت جاہلیہ کی بنا پر اشتعال انگیز حرکتیں کر رہے تھے' اس کے باوجود اہلِ ایمان رسول اللہ ﷺ کے چشم و ابرو کے اشارے کے منتظر رہے تو ان کے حق میں فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الفتح)

''جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ محبت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول پر اور مؤمنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مؤمنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ (الحجرات:۳)

''بے شک وہ لوگ جو رسول اللہ (ﷺ) کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آوازوں کو نیچا رکھتے ہیں' یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔''

تقویٰ کا دوسرا نکتہ شعائر اللہ کی عظمت کا دل میں بیٹھ جانا ہے۔ شعائر اللہ سے مراد وہ تمام

اعمال اور مقامات ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ یعنی عبادات سے ہے اور شعائر اللہ ہی قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ ۭ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج)

''اور یہ کہ جو شعائر اللہ کی عظمت کو سمجھے تو یہ (فعل) دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔''

تزکیہ نفس اور تقویٰ کا حاصل یہ ہے کہ انسان ہر حال کو اللہ سے وابستہ کرے اور نبی کریم ﷺ کے طریقے پر موقع و محل کی تسبیح کو حرزِ جان بنا لے۔ بندے کی یہی کیفیت اللہ عزوجل کو قابلِ قبول ہے:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ﴾ (الحج:۳۷)

''نہ ان (قربانیوں) کا گوشت اللہ کو پہنچتا ہے اور نہ خون' بلکہ اس تک تمہارا (دل کا) تقویٰ پہنچتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی عظمت اور توقیر کا پہلو تقویٰ اور تزکیہ کے لیے اس قدر اہم ہے کہ خواتین کے لیے الگ سے بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت کے ذریعے اسے واضح کیا گیا ہے' جب انہیں کہا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (الاحزاب)

''اے پیغمبر (ﷺ)! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔''

لیکن جب ہماری ماؤں نے ہر حال میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت شعاری کو ترجیح دی تو اللہ کی طرف سے یہ کلام نازل ہوا:

﴿يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ.....﴾ (الاحزاب:۳۲)

''اے نبی کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو.....''

یعنی تمہارا مقام اور مرتبہ امت کی تمام عورتوں سے بلند و بالا ہے اور تمہیں ان کے لیے نمونہ بنایا گیا ہے۔ اتباعِ رسول کا امتحان تحویل قبلہ کے موقع پر' جب اقوالِ سفہاء (بیوقوفوں کے پروپیگنڈے) نے طوفان کھڑا کر دیا تھا' بھی لیا جا چکا تھا۔

یہ ساری باتیں اس لیے عرض کی گئی ہیں کہ تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہے کہ افرادِ اُمت

چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہوں —— تاجر، سپاہی، انجینئر، ڈاکٹر، محقق، موجد، حکمران، سرمایہ دار یا مزدور وغیرہ —— ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت، ان کی عزت و ناموس کی عظمت اور پیروی دنیا جہان سے عزیز ہو۔ اور شعائر اللہ کی عظمت اور رکھوالی ہر شے سے بڑھ کر ہو جائے تو یہ دنیا ان کے لیے ایسی یونیورسٹی بن سکتی ہے جس کو نہ صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق چلا سکتے ہیں بلکہ یہ عباد الرحمٰن اس یونیورسٹی سے پوری دنیا کو اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں۔ اگر ان بنیادوں پر تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کا کام نہیں ہوگا تو پھر وہ رجال کار میسر نہیں آ سکتے جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی دوسری پالیسی بروئے کار آ سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٤﴾﴾ (المائدۃ)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن سے وہ محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے، جو مؤمنوں کے حق میں نرم اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور اللہ بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔''

الغرض تزکیۂ نفس کا حاصل ایسی شخصیات کا وجود میں آنا ہے جو اللہ ربّ العزت اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت رکھنے والی اور غلبہ و اقامتِ دین کے لیے پُرجوش ہوں، لیکن قرآن و سنت کا دامن کسی حال میں بھی چھوڑنے والی نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں بھی ان میں شامل فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآن مجید کو سمجھے بغیر پڑھنا

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کی دو زندگیاں ہیں: ایک دُنیوی اور دوسری اُخروی۔ اوّل الذکر عارضی ہے جو موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور دوسری موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی حقیقی، دائمی اور نہ ختم ہونے والی ہے۔ دنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کی تیاری کے لمحات ہیں۔ یہ شب و روز بہت قیمتی ہیں، کیونکہ ان کو خالقِ کائنات کی رضا کے مطابق بسر کرنے والوں کو آخرت کی ابدی زندگی میں نعمتوں بھری جنت ملے گی، جبکہ دنیوی زندگی خدا فراموشی میں صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گزارنے والوں کے لیے دوزخ کا عذاب تیار ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور اُس نے وقتاً فوقتاً نبی اور رسول بھیجے جو لوگوں کو صراطِ مستقیم دکھاتے رہے۔ سب سے آخر میں خدائی تعلیمات کا فائنل ایڈیشن اور کامل مجموعہ لے کر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے۔ وہ مجموعہ قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے، اسے پڑھ کر اور سمجھ کر ہم اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس کے تراجم اردو زبان میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن مجید کو ترجمے کی مدد سے پڑھیں اور سمجھیں اور اس پر عمل کی کوشش کریں تاکہ ابدی زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔ ہماری زبان اردو ہے، لہٰذا ہم قرآن مجید سے فائدہ اسی صورت میں اٹھا سکتے ہیں جب ہم اس کا ترجمہ اپنی زبان میں پڑھیں۔ جب کوئی شخص اپنی آنکھوں سے خدائی تعلیمات کو دیکھ لے گا تو اس میں خدا کا خوف پیدا ہوگا اور وہ صراطِ مستقیم سے واقف ہوگا تو اب وہ ایسا عمل کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے۔ صرف قرآنی آیات عربی زبان میں پڑھنے سے نزولِ قرآن کا مقصد پورا نہیں ہوتا، لہٰذا لازمی ہے کہ قرآن مجید کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھا جائے تاکہ قرآن کا مقصدِ نزول حاصل ہو سکے۔

قرآن مجید میں سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی اُمتوں کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے

گئے ہیں کہ کس طرح نافرمان قوموں پر عذاب نازل کیے گئے اور وہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنیں گے۔ یہ واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کی امت ان سے آگاہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کرے اور اس کی ناراضگی ہرگز گوارا نہ کرے‘ ورنہ وہ بھی سزا کے مستحق ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید نازل کیا گیا جو کتاب ہدایت ہے۔ یہ انسانوں کے لیے ضابطہ حیات اور راہنما ہے۔ قرآن مجید عربی زبان میں ہے‘ کیونکہ اس کے اولین مخاطب عرب تھے‘ تاہم یہ سارے انسانوں کے لیے ہدایت فراہم کرتا ہے۔ جن کی زبان عربی ہے ان کے لیے تو آسانی ہے کہ وہ قرآن مجید پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف ہو جاتے ہیں۔ چونکہ قرآن ھُدًی للنّاس ہے اس لیے ضروری ہے کہ تمام انسان اس کے احکام کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔ قرآن مجید کا ترجمہ ہر زبان میں ہو چکا ہے اور اب کسی کے لیے یہ عذر باقی نہیں رہا کہ وہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے قرآن مجید سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔

عربی نہ جاننے والے مسلمان قرآن مجید کو اللہ عزوجل کا کلام سمجھتے ہیں‘ اس کا احترام کرتے ہیں‘ اس پر غلاف چڑھاتے ہیں‘ گھر میں اونچی جگہ پر رکھتے ہیں‘ اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے اور کثرت کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ عام طور پر گھروں میں قرآن مجید کے کئی کئی نسخے موجود ہوتے ہیں جن کو افرادِ خانہ تلاوت کرتے ہیں۔ اکثر یہ قرآن مجید معریٰ یعنی ترجمے کے بغیر ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے عقیدت کے ساتھ انہیں تلاوت کرتے ہیں۔ عزت و احترام کے ساتھ اسے اونچی جگہ پر تو رکھتے ہیں مگر اس کی تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کو سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر سمجھے پڑھنے والے منشائے خداوندی سے ناواقف رہتے ہیں‘ مگر مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کا کلام پڑھتے ہیں‘ حالانکہ ان میں سے اکثر کا حال یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے پڑھتے ہیں خود اس کے خلاف کر رہے ہوتے ہیں‘ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾ (آل عمران) ’’جھوٹوں پر اللہ کی لعنت۔‘‘ اور ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (ھود) ’’خبردار! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے!‘‘ سمجھے بغیر قرآن مجید کو پڑھنے والا اس سے ذرا اثر قبول نہیں کرتا۔ جھوٹ بولے جاتا ہے اور ظلم کیے جا رہا ہے۔ اس کو نہیں پتا کہ وہ خود پر اللہ کی لعنت بھیج رہا ہے‘ مگر خوش ہے کہ میں نے

قرآن پڑھ کر نیکی کا کام کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سورۃ البقرۃ میں سود سے روکا گیا ہے اور اس کی زوردار الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۷۹) ’’(سود چھوڑ دو) پس اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے!‘‘ جو شخص اس آیت کی تلاوت کرتا ہے اور اس کا مطلب نہیں سمجھتا اور بدستور سودی کاروبار کرتا رہتا ہے اور سود کھاتے چلا جاتا ہے تو اس کا قرآن پڑھنا کیسا ہے؟ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾ (الاحزاب) ’’جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کو رنج پہنچاتے ہیں ان پر اللہ دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لیے اس نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بتا دیا ہے کہ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (الشمس) ’’پس اس (نفسِ انسانی) کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا‘‘۔ یعنی انسان کو اچھائی اور برائی کا پتا ہے۔ ہر مسلمان کو پتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس بات سے راضی ہوتے ہیں اور کس بات سے ناراض۔

اسی طرح کون نہیں جانتا کہ کسی پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا سبب ہے۔ اب جو شخص قرآن کو سمجھ کر پڑھے گا تو اس کی شناعت سے واقف ہو گا اور اس سے باز رہے گا‘ ورنہ حال مست رہے گا۔ سورۃ النور میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

’’جو لوگ پاک دامن‘ بھولی بھالی‘ باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر پھٹکار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی‘ اور ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔‘‘

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (النساء)

’’اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ

(جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اُس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آج معمولی سے اختلاف یا ناراضگی پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر رہا ہے۔ اگر وہ قرآن مجید کو اللہ کی کتاب جان کر پڑھے گا تو وہ کس طرح دوسرے مسلمان کے قتل پر آمادہ ہو سکے گا۔ وہ دوسرے مسلمان کے ساتھ اچھے طریقے سے معاملہ طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس سلسلہ میں وہ اپنا نقصان برداشت کر لے گا مگر مسلمان کے قتل سے باز رہے گا' کیونکہ وہ پڑھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ مسلمان کو قصداً مار ڈالنے کی سزا جہنم ہے' جس کا ذکر قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ (المائدۃ:۳۸)

''اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے۔''

سمجھے بغیر پڑھنے والے کا اس پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ تو اللہ کا کلام پڑھ کر مطمئن ہو رہا ہے' اس کو احساس ہی نہیں ہے کہ چوری کرنے کی قرآن میں دنیاوی سزا ہاتھ کاٹنا ہے اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے چوری کرنے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ چوری کسی قسم کی بھی ہو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی ہے اور اس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَاۗءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ﴾ (الاحزاب:۵۹)

''اے پیغمبر! (ﷺ) اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (جب وہ باہر نکلا کریں تو) اپنے چہروں پر چادر لٹکا لیا کریں (یعنی گھونگھٹ نکال لیا کریں)۔''

یہ پردے کا حکم ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ازواج اور بنات کے لیے بھی تھا اور مسلمان عورتوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ اب جو عورتیں سمجھے بغیر قرآن پڑھیں گی تو اس آیت کا ان پر کیا اثر ہوگا؟ اور اگر سمجھ کر پڑھیں گی تو ان پر عمل کا داعیہ پیدا ہوگا کہ یہ اللہ کا حکم ہے جو ٹالا نہیں جا سکتا۔ پھر سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۵ میں بتا دیا گیا ہے کہ کن کن لوگوں سے پردے کی ضرورت نہیں' مثلاً

باپ' بیٹے' بھائی' بھتیجے' بھانجے وغیرہ۔ ظاہر ہے جب یہ مستثنیٰ ہیں تو باقی سب سے پردہ کرنا ہے۔ اللہ کے اس حکم کی اہمیت ان عورتوں کو ہی متاثر کرے گی جو سمجھ کر قرآن پڑھیں گی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ (قٓ)

''جو لفظ بھی انسان بولتا ہے تو اس کے پاس ایک مستعد نگران (فرشتہ) ہوتا ہے (جو اس کو لکھ لیتا ہے)۔''

جو اس آیت کا مطلب سمجھ لے گا وہ تو اپنی گفتگو میں محتاط ہوگا کہ منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ لکھا جا رہا ہے' خواہ وہ نیکی کا ہو یا برائی کا' مگر جو شخص سمجھے بغیر پڑھ رہا ہے اس پر اس آیت کا کیا اثر ہوگا؟ وہ جانتا ہی نہیں کہ وہ اپنی زبان سے کیا کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن مجید پڑھ رہا ہے اور خود اپنے اوپر لعنت بھیج رہا ہے' لیکن بے خبر ہے۔

شرک ناقابلِ بخشش گناہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ﴾ (النساء:۴۸'۱۱۶) ''بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دیتا ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے''۔ ترجمے کے بغیر پڑھنے والا یہ آیات تلاوت کر جائے گا اور اسے شرک سے بچنے کا کوئی خیال نہیں آئے گا' کیونکہ وہ قرآن پڑھنے کے باوجود شرک کی شناعت سے بے خبر رہے گا۔ اس کے برخلاف سمجھ کر پڑھنے والا چونک جائے گا اور ہر طرح کے شرک سے بچنے کی کوشش کرے گا' تاکہ شرک کا گناہ اسے دوزخ میں نہ گرا دے۔

مثال کے طور پر یہ چند آیات بیان کر دی گئی ہیں' ورنہ قرآن مجید میں معروف اور منکر کاموں کو تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ چونکہ سمجھے بغیر قرآن مجید پڑھنے سے ہدایت نہیں مل سکتی' اس لیے سمجھ کر پڑھنے کی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے' کیونکہ سمجھے بغیر قرآن پڑھنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے تاکہ اس سے ہدایت حاصل ہو اور سمجھ کر نہ پڑھنے پر ڈانٹا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝۲۴﴾ (محمد)

''بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ رہے ہیں؟''

قرآن تو کتابِ ہدایت ہے۔ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ یہ مقصد سمجھے بغیر پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

پھر قرآن مجید سمجھنے کے لیے آسان بنایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ (القمر)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے' تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟''

یہ آیت سورۃ القمر میں بار بار آئی ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ سوچ سمجھ کر پڑھنے کے لیے قرآن آسان ہے۔ ہر چیز کو سمجھنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے محنت نہ کی جائے اور اس کے آسان ہونے کا مطلب یہ لیا جائے کہ یہ خود بخود ہی ہمیں سمجھ آ جائے گا' غلطی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الزمر)

''اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔''

قرآن مجید میں بیان کی گئی تمام مثالوں سے ہدایت اسی وقت حاصل ہوگی جب انہیں سمجھا جائے۔ ترجمے کے بغیر تو ان مثالوں سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ پورے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر حکم ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ پورے قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ اس کا سمجھے بغیر پڑھنا درست ہے۔ اس کے باوجود قرآن مجید کی صرف تلاوت کو کافی سمجھا جائے' غلطی اور کوتاہی ہے' کیونکہ اس طرح ہدایت حاصل نہ ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کریں گے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝﴾ (الفرقان)

''اور پیغمبر (ﷺ) کہیں گے کہ اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

یعنی اس سے ہدایت حاصل نہیں کرتے تھے۔ اور ہدایت تو صرف سمجھ کر پڑھنے سے ہی آ سکتی ہے۔ سمجھے بغیر قرآن کے تیس پارے بار بار بھی پڑھے جائیں تو ہدایت نہ ملے گی' کیونکہ پڑھنے

والا سمجھ ہی نہیں رہا کہ کیا پڑھ رہا ہے۔ قرآن کو الذکر کہا گیا ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

ذکر کا معنی ہے نصیحت۔ یہ ذکر یعنی قرآن عربی میں ہے' چنانچہ اہلِ عرب تو یہ نصیحت سمجھ لیتے ہیں' لہٰذا ان کے ذمے صرف اس نصیحت پر عمل کرنا ہے' جبکہ ہمیں اول اس نصیحت کو سمجھنا ہے پھر اس پر عمل کرنا ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم شعوری طور پر سنجیدگی کے ساتھ قرآنی نصیحت کو سمجھیں اور پھر اس پر عمل کریں۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب ہے اور اس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ اس کو محبت کے ساتھ دیکھنا بھی فائدہ مند ہے اور اسے ترجمے کے بغیر پڑھنا بھی نفع سے خالی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں جس نے الم پڑھا اسے تیس نیکیاں ملیں گی' حالانکہ الم کے کوئی معنی نہیں جانتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کو ترجمے کے بغیر پڑھنے سے بھی ثواب تو ملتا ہے مگر اس کتاب کا مقصد محض ثواب حاصل کرنا نہیں۔ یہ تو کتاب ہدایت ہے اور جو اس کو سمجھ کر پڑھے گا اسے ہی ہدایت حاصل ہوگی اور وہ اس کے مقصدِ نزول یعنی حصولِ ہدایت کے لیے جدوجہد کرے گا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سمجھے بغیر قرآن مجید پڑھنے کا ثواب تو بہت ملے گا' مگر وہ ثواب ہدایت کا موجب ہوگا تو نفع دے گا' ورنہ قیامت کے دن لوگ بہت ساری نیکیاں (یعنی ثواب) جن کی مثال پہاڑوں سے دی جاسکتی ہے' لے کر آئیں گے' مگر قرآنی ہدایت کی نافرمانی اکثر کی ہوگی' لہٰذا وہ نیکیاں نسیاً منسیاً کر دی جائیں گی۔ صرف وہی نیکیاں نجات کا باعث بنیں گی جو قرآنی ہدایت کے مطابق ہوں گی۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ بھی اگر ناظرہ قرآن پڑھ کر خوش ہوں تو وہ ناسمجھ ہیں کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے شعور کا صحیح استعمال نہیں کر رہے۔ لہٰذا عقل مندی یہ ہے کہ ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کی جائے خواہ وہ چند آیات ہی ہوں مگر ان کے مضمون کو سمجھا جائے تاکہ وہ ہدایت کا موجب بنیں۔

اللہ عزوجل ہمیں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے' اس پر عمل کرنے اور اس کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

طالب علم کا اخلاق کیسا ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر محمد امین ☆

یہ مقالہ ساتویں صدی ہجری کے مسلمان ماہر تعلیم علامہ زرنوجی (۱) کی کتاب تعلیم المتعلم طریق التعلم کی ایک فصل الورع فی حال التعلم کے ترجمہ، تفہیم اور تعلیقات پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس فصل کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ طالب علم کا اخلاق کیسا ہونا چاہیے؟ لہٰذا یہ تحریر پرانی ہونے کے باوجود آج بھی نئی اور ہمارے حسبِ حال ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارا ہر طالب علم اسے اپنا لائحہ عمل بنالے۔

''دورانِ تعلیم متعلّم کے تقویٰ اختیار کرنے کے حوالے سے بعض بزرگ وہ روایت (۲) پیش کرتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو تحصیلِ علم کے دوران تقویٰ کا رویہ اختیار نہ کرے، اسے اللہ تعالیٰ تین مصیبتوں میں سے کسی ایک میں ضرور گرفتار کر دیتا ہے: یا تو اسے جوانی میں موت دے دی جاتی ہے یا اس کی بود و باش جہلاء کی بستیوں میں مقدر کر دی جاتی ہے یا اسے حکمران کی ملازمت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ (۳) متعلّم جتنا متقی اور پرہیز گار رہوگا، اللہ تعالیٰ حصول علم اس کے لیے اتنا ہی سہل بنا دے گا اور اس کے علم کو مفید اور نفع بخش بنا دے گا''---

علامہ زرنوجی نے پہلے منہیات کا ذکر کیا ہے، یعنی ان امور کا جن سے متعلّم کو بچنا چاہیے اور اس کے بعد اوامر کو لیا ہے، یعنی وہ امور جن کو اپنانا اور اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

''متعلّم کو چاہیے کہ وہ پیٹ بھر کر کھانے (۴)، زیادہ سونے (۵)، زیادہ باتیں کرنے (۶) اور جہاں تک ہو سکے بازار کے کھانے سے احتراز کرے (۷)

☆ مدیر ماہنامہ ''البرہان'' لاہور

کیوں کہ بازار میں کھانا پکانے والے ایک تو صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور غلیظ ماحول میں کام کرتے ہیں، دوسرے بازار کا کھانا کھانے سے اللہ کے ذکر سے غفلت کا امکان بڑھ جاتا ہے، کیونکہ بھوکے اور مفلس لوگ بازار میں اس کھانے کو دیکھتے ہیں لیکن اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہٰذا ان کو اذیت پہنچتی ہے اور اس طرح اس کھانے سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔'' (۸)

شیخ محمد بن فضل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ متعلّم تھے تو بازار کے کھانے سے احتراز کرتے تھے۔ ان کے والد گاؤں میں رہتے تھے اور انہیں کھانا پکوا کر بھجواتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بیٹے کو کھانا دینے آئے تو دیکھا کہ اس کے کمرے میں بازار کی روٹی پڑی ہے۔ انہوں نے غصے اور اظہار ناراضی کے لیے بیٹے سے بات ہی نا کی۔ بیٹے نے معذرت کرتے ہوئے کہا، یہ روٹی بازار سے میں نہیں لایا اور نہ میرے مشورے سے لائی گئی ہے، یہ تو میرا ہم جماعت (ہم غرفہ، روم میٹ) لایا ہے۔ والد نے کہا کہ اگر تم احتیاط اور تقویٰ کی زندگی کے خوگر ہوتے تو تمہارے ساتھی کو بھی تمہارے سامنے بازار سے روٹی لانے کی ہمت نہ ہوتی۔ ہمارے اَسلاف اسی طرح تقویٰ اور پرہیز گاری کی زندگی گزارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کی تحصیل اور اس کی نشر و اشاعت کی توفیق دی اور اسی وجہ سے ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے گا---

اسی ضمن میں ایک زاہد فقیہ نے متعلّم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! غیبت (۹) اور کثرتِ گفتگو سے بچو، کیوں کہ جو تمہیں گفتگو میں مصروف رکھتا ہے وہ تمہارا وقت ضائع کرتا اور گویا تمہاری عمر چوری کرتا ہے (۱۰) اور متعلّم کو چاہیے کہ وہ بدعقیدہ، بدکردار اور فتنہ و فساد پھیلانے والے لوگوں سے بچ کر رہے، کیونکہ اگر وہ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہے گا تو اس کے برے اثرات سے بچ نہ سکے گا۔'' (۱۱)

یہاں تک منہیات کا ذکر تھا‘ یعنی وہ امور جن سے متعلّم کو بچنا چاہیے۔ اب مطلوبات کا ذکر ہوگا‘ یعنی وہ امور جن پر متعلّم کو ضرور ہی عمل کرنا چاہیے۔ (مترجم)

’’جب بیٹھنا ہو تو قبلہ رو بیٹھے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ یہی ہے‘ نیز نیک لوگوں کی دعائیں لے اور مظلوم کی بددعا سے بچے---

روایت ہے کہ دو آدمی گھر سے طلب علم کے لیے دوسرے ملک گئے اور اکٹھے تعلیم حاصل کی۔ کئی سال بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹے تو ان میں سے ایک متبحر عالم بن چکا تھا جب کہ دوسرا علم سے کورا تھا۔ شہر کے علماء اس پر متعجب ہوئے اور ان دونوں سے ان کے حالات پوچھنے لگے کہ وہ سبق کیسے پڑھتے تھے‘ دہرائی کیسے کرتے تھے وغیرہ۔ تو ان میں سے جو عالم تھا اس نے کہا کہ وہ قبلہ رو بیٹھتا تھا اور اپنا رُخ آبادی کی طرف رکھتا تھا‘ جب کہ دوسرے نے کہا کہ وہ قبلہ رخ نہیں بیٹھتا تھا اور اپنا رخ بھی آبادی کی طرف نہیں رکھتا تھا۔ اس سے علماء وفقہاء نے یہ متفقہ رائے قائم کی کہ جو عالم بنا‘ وہ اس وجہ سے کہ وہ سنتِ نبی ﷺ کے احترام میں قبلہ رو بیٹھتا تھا[۱۲] اور اپنا رخ آبادی کی طرف رکھتا تھا اور آبادی اللہ کے بندوں سے خالی نہیں ہوتی‘ ہوسکتا ہے اللہ کے کسی نیک بندے نے اس کے لیے تہجد میں دعا کی ہو جو قبول ہوگئی ہو۔[۱۳] پس متعلّم کو چاہیے کہ وہ آداب سے غفلت نہ برتے‘ کیونکہ جو آداب کے بجالانے سے غفلت برتتا ہے‘ وہ سنت سے محروم ہو جاتا ہے اور جو سنت کا تارک ہو وہ فرائض بھی نہیں بجالاسکتا اور جو فرائض کا بھی تارک ہو وہ آخرت کے اجر سے محروم رہ جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے۔[۱۴] اور متعلّم کو چاہیے کہ وہ نوافل کثرت سے پڑھے[۱۵] اور پورے خضوع وخشوع سے پڑھے۔[۱۶] کیونکہ اس سے اسے تحصیل علم میں یقیناً مدد ملے گی---[۱۷]

اپنے زمانے کے عالم وزاہد شیخ نجم الدین عمر بن محمد النسفی کی خدمت

میں شعر پڑھے گئے‘ جن کا ترجمہ یہ ہے:

(شریعت کے) اوامر ونواہی کی حفاظت کر[۱۸] اور نماز کے ادا کرنے پر مداومت اختیار کر[۹] علومِ شرعیہ کی تحصیل کی کوشش کر اور اس میں اعمالِ صالحہ اور اخلاق کریمانہ سے مدد لے تاکہ تو حقیقی عالم بن سکے۔[۲۰] اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ تیرے حافظے کی حفاظت فرمائے تاکہ تجھے حصولِ علم میں آسانی ہو‘ اور اللہ ہی بہترین حفاظت فرمانے والا ہے---[۲۱] تو انہوں نے جواب میں کہا: اللہ و رسول (ﷻ و ﷺ) کی اطاعت کرو اور خوب محنت کرو اور ہرگز سستی نہ کھاؤ کہ تمہیں پلٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے[۲۲] اور راتوں کو کم سویا کرو کہ بہترین لوگ وہی ہیں جو رات کو کم سوتے ہیں---[۲۳]

طالب علم کو چاہیے کہ ہر وقت اپنی نوٹ بک اپنے ساتھ رکھے‘ تاکہ جہاں بھی اسے موقع ملے اس کا مطالعہ کر سکے[۲۴] اور جس کے تھیلے میں نوٹ بک نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا دل ابھی تحصیل علم کا شیدا نہیں ہوا اور چاہیے کہ اس کی نوٹ بک میں کچھ خالی اوراق بھی ہوں اور اس کے پاس (قلم) دوات بھی ہو‘ تاکہ وہ حسبِ ضرورت اساتذہ سے جو سنے لکھ بھی سکے۔[۲۵] پھر انہوں نے (یعنی امام نسفی نے) ہمیں دوات رکھنے کی فضیلت کے بارے میں حضرت ہلال بن یسار رضی اللہ عنہ کی حدیث سنائی۔[۲۶]

تعلیقات وحواشی

(۱) برہان الدین الزرنوجی ایک عرب فلسفی اور ماہرِ تعلیم تھے‘ ان کی تاریخ ولادت اور وفات کا حتمی تعین نہیں کیا جاسکا‘ تاہم مختلف قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) کے لگ بھگ تھا۔ وہ مشہور حنفی فقہاء المرغینانی (حنفی فقہ کی مشہور کتاب الھدایۃ کے مصنف) اور قاضی خان (صاحب فتاویٰ قاضی خاں) کے شاگرد تھے۔ [دیکھئے کشف الظنون‘ ۳۱۳۴‘ و براکلمان‘ ج ۱‘ ص ۳۷۹]

علامہ زرنوجی کی دیگر تالیفات زمانے کی دست برد کا شکار ہوگئیں اور ہم تک نہیں پہنچیں، سوائے تعلیم میں ایک مختصر رسالے تعلیم المتعلم طریق التعلم کے۔ براکلمان کے نزدیک رسالے کا صحیح نام تعلیم المتعلم لتعلم طریق العلم ہے [دیکھئے تکملہ، ج ۱، ص ۸۳۷] اس کتابچے میں علامہ زرنوجی نے طالب علم کو (طلبِ علم کے حوالے سے) علماء کے اخلاقی نقطۂ نظر سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا رسالہ زیادہ تر متقدمین کے اقوال پر مشتمل ہے، جنہیں سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مختصر اور مدلّل ہونے کی بنا پر یہ رسالہ اہلِ علم میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

علامہ زرنوجی اگرچہ حنفی المسلک تھے [علامہ محمود بن سلیمان الکفوی نے اعلام الاخیار من فقہاء مذھب النعمان المختار میں انہیں احناف کے بارہویں طبقے میں شمار کیا ہے۔ بحوالہ فہرست برلن عدد ۱۱۱، مرتبہ اہلورد] اور زیر بحث رسالے میں انہوں نے جن متقدمین کی آراء کا ذکر کیا ہے، وہ بھی اکثر و بیشتر حنفی ہی ہیں، لیکن نفسِ مضمون کا چونکہ فقہ یا اختلافی امور سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا ان کے تعلیمی نظریات کے حوالے سے یہ چیز غیر متعلق ہے۔

ہمارے سامنے اس رسالے کا وہ عربی ایڈیشن ہے جو ۱۳۴۷ھ میں مصر سے شائع ہوا اور جس میں علامہ زرنوجی کے رسالے پر شیخ ابراہیم بن اسماعیل کی شرح بھی ہے، جس سے ہم نے بھی استفادہ کیا ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے دائرۃ المعارف الاسلامیہ، طبع قاہرہ بذیل مادہ]

(۲) تلاشِ بسیار کے باوجود یہ حدیث ہمیں کُتبِ احادیث میں نہیں ملی۔

(۳) ان تینوں صورتوں میں سے ہر ایک کا حاصل یہ ہے کہ ایسے طالب علم کو نہ تو حاصل کردہ علم پر آسانی سے عمل کرنے کی توفیق میسر آتی ہے اور نہ وہ اس علم کو پھیلا سکتا اور دوسروں تک پہنچا سکتا ہے، جب کہ یہی دونوں امور علم حاصل کرنے کے حقیقی اہداف اور مقاصد ہیں۔ اگر جوانی میں موت آ گئی تو ان دونوں نعمتوں سے محروم ہو گیا اور اگر علم اور اہلِ علم سے دور جہلاء کی بستیوں میں رہنا اس کا مقدر کر دیا گیا تو ان جہلاء کے درمیان رہنا خود ایک اذیت اور عذاب سے کم نہیں، کیونکہ نہ وہ اس علم کی قدر کریں گے اور نہ اس سے علم

حاصل کریں گے اور نہ اسے مہذب اور شائستہ علمی ماحول میسر آئے گا کہ اس کی علمی یا ادبی نشو ونما ہو، چنانچہ تنگی اور ضیق کی زندگی گزارے گا۔ جہاں تک تیسری مصیبت کا تعلق ہے، اس کا اندازہ شاید ہمیں آسانی سے نہ ہو سکے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک حکومت اور ریاست میں وہ فرق بہت نمایاں نہ تھا جو آج ہے، لہٰذا اس وقت سرکاری ملازمت حکمرانوں کی ذاتی نوکری کے مترادف تھی، جس میں آدمی خواہی نخواہی حکمرانوں کے گناہ وثواب میں شریک سمجھا جاتا تھا اور اپنی آزاد مرضی اور آزاد علمی روش برقرار رکھنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اہل علم سرکاری ملازمت سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنی غیر جانبداری، علمی آزادی اور شخصی وقار کے تحفظ کے لیے ایسے پیشے اختیار کرتے تھے جن میں ان پر حرف نہ آئے، مثلاً تجارت یا صنعت وحرفت۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے شخص نے کوڑے کھانے منظور کر لیے لیکن سرکاری ملازمت اور حکومت سے وابستگی کو شدت سے رد کر دیا۔ آج کل بھی کئی اہلِ علم اسی وجہ سے سرکاری ملازمت پسند نہیں کرتے۔

(۴) پیٹ بھر کر کھانا ذہنی یکسوئی اور قلبی توجہ کے لیے بہت مضر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ ہے کہ جب تک خوب بھوک نہ لگے نہ کھایا جائے اور پیٹ بھرنے سے پہلے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا جائے [صحیح بخاری، کتاب الادب] قدیم وجدید طب کی رو سے جسم، خصوصاً معدے کے لیے یہ ایک سنہری اصول ہے۔ پیٹ بھر کر کھانے سے جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے، سوچنے کا عمل سست پڑ جاتا ہے اور تخلیقی وتحقیقی صلاحیت کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس پیٹ نہ بھرا ہونے کی صورت آدمی چست رہتا ہے، اس کے قویٰ میں تحرک اور نشاط رہتا ہے اور اس کی ذہنی اور باطنی صلاحیتیں نکھرتی ہیں۔ صوفیہ بھی انہی وجوہ سے کثرتِ طعام کو بُرا سمجھتے ہیں۔

(۵) ایک شخص جس کے سامنے زندگی میں کوئی مقصد ہو، اسے اتنا ہی سونا چاہیے جتنا سونا اس کے جسم کی مجبوری ہو، یعنی اسے کم سے کم سونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہیے۔ طالب علم کی عمر وہ عمر ہوتی ہے (یعنی لڑکپن اور آغاز جوانی) جس میں آدمی کی صلاحیتیں عروج پر ہوتی ہیں اور اس وقت عموماً اس کے ذمے ایک ہی کام ہوتا ہے اور وہ ہے تحصیل

علم۔ لہٰذا ایک طالب علم کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کا بہت بڑا حصہ حصولِ علم میں صرف کرے اور کم سے کم سوئے۔ اس کے برعکس اگر وہ سونے کی لذت کو اپنے اوپر طاری کر لے تو وہ کلاس میں بھی اونگھتا رہے گا اور گھر آ کر بھی سوتا رہے گا' اس طرح وہ علم کی لذت سے محروم رہے گا۔ سچ یہ ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اور جو جاگتا ہے وہ پاتا ہے اور یہ کہ جو علم کے لیے جاگتا ہے' اس کا مقدر بھی جاگ جاتا ہے اور جو علم حاصل کرنے کی بجائے سوتا رہتا ہے' اس کا مقدر بھی سو جاتا ہے۔

(۶) زیادہ باتیں کرنے کے نقصان بہت واضح ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ زبان کا غلط استعمال آدمی کو جہنم میں لے جاتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ جو بھی مجھے اپنی زبان کی حفاظت کی ضمانت دے' میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں [مسند احمد' ج ۱' ص ۱۷۶' طبع قاھرہ] اسی لیے دانا کہتے ہیں کہ پہلے تولو' پھر بولو۔ ہر وقت بولتے رہنا خطرے سے خالی نہیں' کیونکہ اس سے معصیت میں مبتلا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ غیبت' چغلی' جھوٹ' بہتان طرازی' طنز و تشنیع' نام بگاڑنا' گالی دینا اور فحش گوئی سب زبان کے ہی گناہ ہیں۔ ان سب سے اگر بچ بھی گیا تو بھی زیادہ بولنا لغو اور لہو تو ہے ہی' کہ اگر گفتگو ضروری' مفید اور نفع بخش نہ ہو تو یہ وقت اور قوت کا ضیاع ہے۔ اسی وقت اور صلاحیت کو اگر وہ خیر کے کسی کام میں لاتا تو اس سے کتنا فائدہ ہوتا۔ لہٰذا فضول گپ شپ میں وقت ضائع کرنا متعلّم کا اور کسی ایسے شخص کا جو زندگی کو سنجیدگی سے لیتا ہو اور زندگی میں کچھ کرنا اور بننا چاہتا ہو' وتیرہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

(۷) سنجیدہ اور معتبر لوگ آج کل بھی بازار جا کر کھانے اور بازار کے کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔ بازار کا کھانا گو بظاہر لذیذ اور چٹ پٹا کیوں نہ ہو لیکن دو خرابیاں اس میں بالعموم پائی جاتی ہیں' ایک تو یہ کہ وہ گندا ہوتا ہے (گو بظاہر صاف ستھرا نظر آتا اور صاف برتنوں میں پیش کیا جاتا ہے) گندے ماحول میں تیار کیا جاتا ہے اور اسے تیار کرنے والے بالعموم گندے ہوتے ہیں۔ تنور والے جب آٹا گوندھتے ہیں تو گوندھنے والے کا گندا پسینہ اس میں گرتا رہتا ہے۔ یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے۔ علاوہ ازیں بعض لوگ آٹا زیادہ ہو تو پیروں سے بھی گوندھتے ہیں۔ اگر بیکری کا سامان بسکٹ' مٹھائی وغیرہ

ہو تو مکھیاں وغیرہ بھی اس میں گرتی رہتی ہیں' برتن بھی صاف اور گرم پانی سے اچھی طرح نہیں دھوئے جاتے۔ اجناس' خصوصاً گھی اچھی کوالٹی کا نہیں ڈالا جاتا۔ ان وجوہ سے ہوٹلوں کا کھانا کھا کر آج بھی اکثر لوگ بیمار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک استاذ میٹرک کے طلبہ کو' جب ان کا بورڈ کا امتحان سر پہ ہوتا' یہ بار بار تاکید کرتے کہ ان دنوں بازار کا کھانا ہرگز نہ کھانا' کیونکہ اگر بیمار ہو جاؤ گے' گلا وغیرہ خراب ہو گیا تو تندرست ہونے میں کئی دن لگ جائیں گے' جب کہ تمہارا وقت بہت قیمتی ہے اور امتحان سر پہ ہے۔

(۸) کھانے میں برکت کا ہونا اور بعض حالات میں اس سے برکت کا اٹھ جانا' کچھ علامہ زرنوجی کی نکتہ طرازی نہیں' بلکہ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مل کر کھانے سے اور بسم اللہ پڑھ کر کھانے کی ابتداء کرنے سے کھانے میں برکت پیدا ہو جاتی ہے [سنن ابی داؤد' کتاب الاطعمة] اور کافر جب کھاتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان بھی شامل ہو جاتا ہے اور وہ سیر نہیں ہو پاتا [صحیح مسلم' کتاب الاشربة/ ابن ماجہ' کتاب الاطعمة] (گویا کھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے) جو کھانا مسلمان مفلسوں اور بھوکوں کے لیے باعث اذیت ہو' اس سے برکت کا اٹھ جانا بعید از فہم نہیں۔

(۹) غیبت کبیرہ گناہوں میں سے ہے' لیکن بدقسمتی سے ہمارے زمانے کے لوگ اسے بہت ہلکا سمجھتے ہیں اور اس میں عام طور پر مبتلا ہیں۔ غیبت کرنے کو اللہ تعالیٰ نے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے [الحجرات ۴۹: ۱۲] اور اس کی شناعت میں متعدد صحیح احادیث مروی ہیں۔ [رواہ مسلم و البیھقی فی شعب الایمان]

(۱۰) کثرت سے گفتگو کرنے والے کو عمر چوری کرنے والے کہنا نہایت لطیف اور گہری بات ہے' کیونکہ جو شخص کسی متعلّم سے فضول گپ شپ کرتا ہے وہ درحقیقت اس کا وقت ضائع کرتا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی!

اور جو وقت بے مصرف صرف ہوا گویا وہ ضائع ہو گیا اور جس نے ضائع کیا گویا اس نے وقت کی چوری کی۔ اب چوری کی شناعت ہمارے ہاں معروف ہے کہ اس کی سزا ہاتھ

کاٹنا ہے۔ یہ کبیرہ گناہ ہے اور مسلمان کے لیے سوسائٹی میں باعثِ ننگ و عار ہے۔

(۱۱) جیسی آدمی کی صحبت ہوتی ہے ویسے ہی اس پر اثرات پڑتے ہیں۔ اچھی صحبت کے اچھے اثرات اور بری صحبت کے برے اثرات۔ بقول فارسی مثل کے کہ:

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند

اور اس بارے میں صحیح حدیث بھی ہے کہ عطار کے پاس جاؤ گے تو معطر ہو گے اور لوہار کے پاس جاؤ گے تو دھوئیں اور دھونکنی سے کپڑے جلاؤ گے اور بدبو پاؤ گے [متفق علیہ] لہٰذا علامہ زرنوجی طالب علم کو نصیحت کر رہے ہیں کہ بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ نہ اٹھو بیٹھو ورنہ تم بھی بدعقیدہ ہو جاؤ گے۔ جو لوگ اللہ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور معصیت پر دلیر ہیں، ان کی صحبت میں رہو گے تو انہی جیسی عادتیں سیکھو گے اور اگر فتنہ و فساد پھیلانے والوں کے ساتھ رہو گے تو انہی جیسے ہو جاؤ گے، کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ صحبت کا اثر نہ ہو۔ بُری صحبت کا بُرا اثر تو ہو گا۔

(۱۲) بدقسمتی سے ہمارے زمانے میں سنت نبی ﷺ کو وہ اہمیت اور احترام نہیں دیا جاتا جو ایک سچے مسلمان کو دینا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کا اتباع ایک قانونی تقاضا بھی ہے، لہٰذا جو نبی ﷺ سے محبت نہیں کرتا، حدیث صحیح کے الفاظ میں اس کا ایمان ناقص ہے [صحیح بخاری، کتاب الایمان] اور آپ ﷺ کے اتباع کی ضرورت و اہمیت اور مدارِ ہدایت ہونے پر بہت سی قرآنی آیات شاہد ہیں۔ [الاحزاب ۳۳:۳۶/ محمد ۴۷:۳۳/ النساء ۴:۶۵]

لیکن اہلِ دل اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ان سنتوں پر بھی عمل کیا جائے جن پر عمل کرنا قانونی تقاضا نہیں ہے، مثلاً کھانا، پینا اور اوڑھنا پہننا وغیرہ۔ گویا نشست و برخواست میں جو بھی پوزیشن اختیار کر لی جائے وہ غیر اسلامی نہیں (مثلاً کرسی، میز پر بیٹھنا یا زمین یا چارپائی پر بیٹھنا وغیرہ) لیکن اگر کوئی اس طرح بیٹھے جس طرح نبی اکرم ﷺ بیٹھتے تھے، تو یقیناً اسے سنت پر عمل کرنے کا ثواب ملے گا۔ اسے ایک اور مثال سے سمجھئے، نبی اکرم ﷺ نے مسواک کرنے کا حکم دیا ہے [بخاری، کتاب الوضوء/ مسلم و ابی داؤد، کتاب الطہارۃ] اور آپ ﷺ

خود باقاعدگی سے مسواک کرتے تھے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ دانت باقاعدگی سے صاف کیے جائیں۔ اب اگر کوئی شخص ٹوتھ برش سے باقاعدگی سے دانت صاف کرتا ہے تو گویا شریعت کا مقصد پورا ہو گیا، لیکن اگر کوئی شخص مسواک کرتا ہے تو نہ صرف اس کے دانت صاف ہو گئے بلکہ وہ مسواک کی سنت پر عمل کرنے کی بناء پر مستحق ثواب بھی ہے۔

(۱۳) مسلمانوں میں بہت سی دعائیں اجتماعی صیغوں میں مانگی جاتی ہیں۔ ہم بطور مثال ایک قرآنی اور ایک مسنون دعا کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱﴾

(البقرۃ)

''اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا''---

اور نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ))

[سنن ابی شیبہ و سنن الکبریٰ، مرفوعاً عن عمر رضی اللہ عنہ]

''اے اللہ! مجھے بخش دے اور دوسرے مومن مردوں اور عورتوں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی بخش دے۔''

اسی طرح امتحانوں کے دنوں میں ہم نے بعض ائمہ و خطباء کو جمعہ کے خطبوں میں یہ دعا مانگتے سنا ہے کہ اے اللہ! ہمارے بچوں کو دینی و دنیوی امتحانوں میں کامیاب فرما، ان کو علم نافع عطا فرما وغیرہ۔ اس طرح کی اجتماعی دعا اگر اللہ کا کوئی نیک بندہ مانگے تو وہ ایسے مسلمانوں کے حق میں قبول ہو سکتی ہے جنہیں اس کی خبر بھی نہ ہو، کہ کوئی ان کے لیے دعا مانگ رہا ہے۔ کچھ اس طرح کی صورت حال کی طرف علامہ زرنوجی نے اشارہ کیا ہے کہ مذکور طالب علم آبادی کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھتا تھا، اللہ کے کسی نیک بندے نے اجتماعی دعا کی، جو اس کے حق میں بھی قبول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس متعلّم کو علم عطا فرما دیا۔

دعا کی اہمیت بھی اپنی جگہ ایک مسلّمہ دینی مسئلہ ہے۔ دعا مانگنی چاہیے، اپنے لیے بھی اور

دوسروں کے لیے بھی۔ دعا عبادت کا مغز ہے' یہ اللہ کو بہت پسند ہے' لہٰذا اپنی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی حاجت' خواہ دینی ہو یا دنیوی' اللہ سے مانگنی چاہیے۔ چونکہ وہ اس کائنات اور اس کے اسباب و ذرائع سب کا خالق و مالک ہے' لہٰذا اس کی جناب میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے' جو چاہے اور جتنا چاہے عطا کر سکتا ہے' کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ لہٰذا اللہ سے مانگنا چاہیے اور خوب مانگنا چاہیے اور اس تیقّن کے ساتھ مانگنا چاہیے کہ وہ دینے پر قادر ہے اور ضرور دے گا۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ خضوع وخشوع سے دعا مانگنے اور دعا کی قبولیت کا بہترین وقت تہجد کا ہے' یعنی طلوعِ سحر سے پہلے رات کے آخری پہر کا وقت۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف متوجہ ہوتا' اور فرماتا ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ اسے بخش دیا جائے؟

[صحیح بخاری' کتاب التهجد/ سنن ترمذی' ابواب الصلوٰۃ]

ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں تہجد کے وقت اٹھ کر اللہ سے دعا مانگنے کی توفیق دے۔

(۱۴) آسان سے مشکل کی طرف سفر ہی انسان کی فطرت ہے' چنانچہ جو اساتذہ اور مربی اس انسانی فطرت سے واقف ہیں اور تدریس وتربیت میں اس اصول پر عمل کرتے ہیں وہی مؤثر اور کامیاب رہتے ہیں۔ چنانچہ صوفیاء دورانِ تربیت اپنے تلامذہ کو مکروہات و مباحات اس طرح ترک کراتے ہیں جیسے حرام کو ترک کیا جانا چاہیے اور مستحبات پر اس شدت سے عمل کراتے ہیں جیسے اوامر و واجبات کے ادا کرنے میں شدت ہونی چاہیے۔ طلبہ تربیت کی اس کٹھالی سے جب نکل جاتے ہیں تو شریعت کے اوامر و واجبات پر عمل اور حرام ومنہیات کا ترک ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کی بات یہاں علامہ زرنوجی نے کہی ہے کہ جو آدمی شریعت کے آداب کا خیال رکھے گا' اسے سنتوں پر عمل کرنے میں آسانی ہو جائے گی اور جو سنتوں پر باقاعدگی سے عمل کرے گا' واجبات پر عمل اس کے لیے سہل ہوگا۔ اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے' یعنی جو آداب شریعت کا خیال نہیں رکھے گا' اس سے کیسے توقع رکھی جائے کہ وہ سنتوں پر عمل کرے گا اور جو سنتوں

کا تارک ہو وہ فرائض وواجبات پر کیسے عمل کرے گا؟

(۱۵) مطولات میں علامہ زرنوجی سب سے پہلے نوافل کو لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ متعلّم کو نوافل کثرت سے پڑھنے چاہئیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ وہ یہ نہیں کہہ رہے کہ متعلّم کو پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھنی چاہیے' بلکہ کہہ رہے ہیں کہ نوافل کثرت سے پڑھنے چاہئیں۔ اس کی چند اہم حکمتیں ہیں' ایک تو یہ کہ کثرتِ نوافل یا کثرتِ صلوٰۃ بہت بڑا ذریعہ ہے تقرّب الی اللہ کا۔ دوسرے نماز کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ذکر کہا ہے [طٰہٰ ۲۰:۱۴] اس طرح کثرتِ نوافل گویا کثرتِ ذکر ہے۔ کثرتِ ذکر سے مراد یہ ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ کو یاد رکھے۔ اس سے معصیت کا امکان کم ہو جاتا ہے اور فرائض احسن طریقے سے بجالانے میں مدد ملتی ہے۔ سوم یہ کہ جو کثرت سے نوافل پڑھتا ہے اس کے بارے میں یہ تصور کرنا بعید از قیاس اور بعید از فہم ہے کہ وہ فرض نماز کی ادائی میں غفلت کرے گا' جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

(۱۶) ہمارے نزدیک خضوع وخشوع شرائطِ قبولیتِ نماز میں سے ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ کی موجوگی میں نماز پڑھی اور ارکانِ نماز کا حق ادا نہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز دہراؤ' تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے دوبارہ ویسی ہی نماز پڑھی' تو آپؐ نے پھر فرمایا کہ نماز دہراؤ تم نے نماز ادا نہیں کی۔ اس پر اس نے پوچھا کہ (قابلِ قبول) نماز کیسے ادا کروں؟ تو آپ ﷺ نے اسے وقار' سکون اور اطمینان سے ارکانِ نماز ادا کرنے کا حکم دیا [متفق علیہ] اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ خضوع وخشوع ایک داخلی کیفیت ہے' جس کو ناپا' تولا نہیں جا سکتا' اس لیے شارع علیہ السلام نے وقار' سکون اور اطمینان کو شرطِ قبولیتِ نماز قرار دیا اور یہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ جو امر کسی حکم شرعی کا سبب ہو تو اس کا حکم وہی ہوگا جو اس حکم شرعی کا ہوگا' جیسے قرآن نے زنا کو حرام قرار دیا تو شارع علیہ السلام نے شہوت سے غیر محرم کو دیکھنے اور شہوت کی گفتگو کرنے اور سننے کو بھی حرام اور آنکھوں' زبان اور کانوں کا زنا قرار دیا' کیوں کہ ان اعضاء کا غلط استعمال بالآخر عملی زنا کا سبب بنتا ہے' لہٰذا جب نبی کریم ﷺ نے وقار' سکون اور اطمینان سے نماز ادا کرنے کو شرطِ قبولیت نماز قرار دیا اور یہ امور سبب ہیں خضوع وخشوع

کا‘ تو خضوع وخشوع کا بھی وہی حکم ہوگا جو سکون واطمینان سے ارکانِ نماز ادا کرنے کا ہے‘ یعنی شرطِ قبولیتِ نماز ہونا۔ تاہم ظاہر ہے کہ یہ حکم مبنی بر قیاس ہے‘ مبنی بر نص نہیں۔

خضوع وخشوع کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کے بغیر نماز کے مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے‘ مثلاً نماز کے بڑے مقاصد میں سے یہ ہے کہ یہ اللہ کا ذکر ہے‘ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے‘ فحاشی ومنکرات سے روکتی ہے وغیرہ۔ تو جب تک نماز خضوع وخشوع سے ادا نہیں کی جائے گی‘ نماز انسان پر طاری نہیں ہوگی‘ تو نماز کے اثرات کیسے وقوع پذیر ہوں گے؟ لہٰذا علامہ زرنوجی کا یہ کہنا بجا ہے کہ متعلّم کو نوافل کثرت سے پڑھنے چاہئیں اور خضوع وخشوع سے پڑھنے چاہئیں۔

(۱۷) نوافل کثرت اور خضوع وخشوع سے پڑھنے سے تحصیل علم میں مدد ملتی ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں‘ ایک تو تہجد کی نماز کے نوافل ادا کرنے سے آدمی وقت کا پابند ہو جاتا ہے اور وقت کی تنظیم کرنا سیکھ جاتا ہے۔ یہ چیز متعلّم کے تعلیمی اوقات کی تنظیم اور وقت کے بہتر اور مفید استعمال میں اس کے کام آتی ہے۔ دوم‘ جو شخص نوافل ادا کرنے میں سرگرم اور منہمک ہو جاتا ہے‘ یہ ممکن نہیں کہ اس سے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی ہو اور تحصیلِ علم بلاشبہ فرض ہے۔ سوم‘ خضوع وخشوع اور باقاعدگی سے نوافل کی ادائیگی انسان کو ذمہ دار‘ بردبار اور سنجیدہ بنا دیتی ہے اور جب طالب علم میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہو جائے اور سنجیدگی آ جائے تو اس کے کامیاب متعلّم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

(۱۸) یعنی متعلّم کو چاہیے کہ جن اچھے کاموں کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے‘ انہیں بصد شوق بجا لائے اور جن بُرے کاموں کے کرنے سے اس نے منع کیا ہے وہ نہ کرے اور ان سے رک جائے۔ یاد رہے کہ شریعت کے سارے احکام اوامر ونواہی سے ہی متعلق ہیں‘ لہٰذا جس شخص نے ان اوامر ونواہی پر عمل کرنا شروع کر دیا گویا اس نے ساری شریعت کو پالیا۔

(۱۹) اوامر ونواہی کا بالعموم ذکر کر کے نماز کا خصوصی طور پر ذکر کیا کہ اس کی حفاظت کی جائے اور اس پر مداومت اختیار کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز اس خصوصی سلوک اور تذکرے کی مستحق بھی ہے‘ کیونکہ جو بھی شخص نماز کی حقیقت پر غور کرے گا‘ وہ اس کی اہمیت کو پالے گا کہ نماز بندے کو اللہ سے جوڑتی ہے‘ یہ ان کے درمیان براہ راست

رابطے اور تعلق کی ایک شکل ہے‘ یہ اللہ کا ذکر ہے۔ نماز کی بار بار ادائیگی بندے کو اللہ سے غافل نہیں ہونے دیتی‘ یہ انسان کو برائیوں سے روکتی ہے‘ نظافت کا سبب ہے‘ وقت کی پابندی سکھاتی ہے اور اجتماعیت کو منظّم کرتی ہے۔ غرض نماز کے فائدے بے شمار ہیں‘ جنہیں چشم بینا ہر وقت مشاہدہ کر سکتی ہے۔

(۲۰) یعنی متعلّم کو چاہیے کہ اپنے ہدف کو ہمیشہ سامنے رکھے اور ایک طالب علم کا ہدف اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ حصول علم میں کامیاب ہو جائے اور صحیح معنوں میں عالم بن جائے۔ بدقسمتی سے آج کل طالب علموں میں ڈگریوں کے حصول کی دوڑ لگی ہوئی ہے اور مقصد صرف ڈگری کا حصول ہے تاکہ ملازمت مل جائے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ دونوں بڑے سطحی مقصد ہیں۔ طالب علم کا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ سچ مچ علم حاصل کرے‘ تاکہ اس پر عمل کر کے دین ودنیا میں فوز وفلاح پا سکے۔

حقیقی عالم بننے میں دو اصول اہم کردار ادا کرتے ہیں‘ جن کی طرف علامہ زرنوجی نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ ایک اعمالِ صالحہ اور دوسرے اعلیٰ اخلاق۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ دونوں امور علم حاصل کرنے کا سبب اور وسیلہ بھی ہیں اور اس کا نتیجہ بھی۔ ظاہر ہے جب آدمی اعمال صالحہ بجا لائے گا اور کریمانہ اخلاق کا مالک ہوگا تو وہ سعادت سے ہم کنار ہوگا‘ اس کی زندگی میں یکسوئی اور اطمینان ہوگا‘ وہ لوگوں سے خوش ہوگا اور لوگ اس سے خوش ہوں گے‘ اس کی صلاحیتیں نکھریں گی‘ اس کے اندر اچھی عادتیں پروان چڑھیں گی اور یہ ساری چیزیں حصولِ علم میں مددگار ثابت ہوں گی اور وہ حقیقی عالم بن کر نکلے گا۔

(۲۱) دعا کی فضیلت اور فائدے اس سے پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ یہاں علامہ زرنوجی متعلّم کو یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے حافظے کی حفاظت کے لیے دعا گو رہے‘ تاکہ اسے حصولِ علم میں آسانی رہے۔ ظاہر ہے کہ ایک متعلّم کے طلب علم میں کامیابی وناکامی کا انحصار اس کے حافظے پر ہے۔ جس طالب علم کا حافظہ قوی ہوگا‘ اس کی کامیابی کے امکانات نمایاں ہوں گے اور جس کا حافظہ خراب اور ردّی ہوگا‘ اس کی ناکامی کے اسباب بڑھ جائیں گے۔ لہٰذا اس قیمتی متاع کی طالب علم کو حفاظت کی کوشش

بھی کرنی چاہیے اور اللہ سے اس کے لیے دعا بھی مانگنی چاہیے۔ جہاں تک اس کے لیے کوشش کرنے کا تعلق ہے تو اس کا ذکر بالواسطہ پہلے آ چکا‘ کیونکہ وہ ترکِ معاصی (اور فضائل پر عمل) ہے‘ جیسا کہ امام شافعیؒ کی مشہور رباعی ہے:

شَكَوْتُ اِلٰى وَكِيعٍ سُوْءَ حِفظى — فَاَرْشَدَنِى اِلٰى تَركِ المعاصى
فَاِنَّ العِلْمَ فَضْلٌ مِنْ اِلٰهٍ — وَ فَضْلُ اللّٰهِ لا يُعطٰى لِعاصى

’’میں نے اپنے استاد وکیع سے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے ترکِ معصیت کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ علم اللہ کا فضل ہے اور اللہ کے احکام کے نافرمان‘ اس کے فضل کے مستحق نہیں ہوتے‘‘---

لہٰذا کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ حافظے کی حفاظت کے لیے اللہ سے دعا بھی کرنی چاہیے‘ کیونکہ وہ مسبّب الاسباب ہے اور سارے اسباب اسی کے اختیار میں ہیں‘ ورنہ شعوری کوششوں کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت باندازِ دگر ہو‘ تو خدانخواستہ ایسا صدمہ پہنچ سکتا ہے کہ دماغ الٹ جائے یا ایسی چوٹ لگ سکتی ہے کہ دماغ مجروح ہو جائے۔ لہٰذا ایک طالب علم کو حافظے کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے۔

(۲۲) علامہ نسفی کے سامنے جو اشعار پڑھے گئے‘ اگرچہ ان میں شریعت کے علم کے حصول‘ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی‘ اعلیٰ اخلاق اور اللہ تعالیٰ سے دعا جیسے امور موجود ہیں‘ لیکن اس کے باوجود علامہ نے مناسب سمجھا کہ اپنے مخاطب کو فکرِ آخرت کی تلقین کریں اور اسے یاد دلائیں کہ ہماری آخری منزل اللہ کے حضور پیش ہو کر اعمال کی جواب دہی کرنا ہے‘ لہٰذا طاعات کے بجالانے میں سستی نہ کی جائے‘ بلکہ اس پر اپنی پوری قوت صرف کر دی جائے۔

(۲۳) اور طاعات میں سے بھی تہجد یعنی رات کے وقت جاگ کر اللہ کے حضور گڑگڑانا‘ فریاد کرنا‘ آہ و زاری کرنا‘ سرِفہرست رکھا اور اپنے مخاطب کو یاد دلایا کہ نیک اور متقی لوگ ہمیشہ شب زندہ دار رہے ہیں‘ لہٰذا تم بھی اگر ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہو تو راتوں کو کم سویا کرو‘ بہت جاگا کرو اور اللہ کی عبادت میں اپنے آپ کو تھکایا کرو۔

(۲۴) اس سے علامہ زرنوجی کی مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اپنا ہر لحظہ طلب علم کے لیے وقف کر دینا

چاہیے اور جو وقت بھی اسے ملے وہ مطالعے میں صرف کرنا چاہیے۔ اسے ہر وقت اپنے پاس قابلِ مطالعہ مواد رکھنا چاہیے تاکہ جب بھی اسے کچھ وقت ملے تو اسے بے کار ضائع کرنے‘ سونے یا غیر مفید باتیں سوچنے اور کرنے کی بجائے اسے مطالعے میں صرف کرے۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب طالب علم کو مطالعے کا چسکا لگ جائے اور مطالعہ اس کا اوڑھنا‘ بچھونا بن جائے۔ چنانچہ یہی کیفیت علامہ زرنوجی طالب علم کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

(۲۵) اپنے پاس ہر وقت قابلِ مطالعہ مواد رکھنے کے ساتھ علامہ زرنوجی طالب علم کو یہ نصیحت بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے پاس ہر وقت لکھنے کا سامان بھی رکھے۔ اس زمانے کے مطابق قلم‘ دوات اور سفید کاغذ اور آج کل کی اصطلاح میں کاپی‘ پنسل یا نوٹ بک اور بال پوائنٹ‘ تاکہ جس وقت بھی اسے اہلِ علم کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے‘ وہ نوٹس لے سکے اور علم محفوظ کر سکے۔ پھر بعد میں ان کی تبییض کر کے ان کی تدوین کر لے۔

(۲۶) اس کے بعد علامہ نسفیؒ نے حضرت ہلال بن یاسر ؓ کی وہ حدیث ہمیں سنائی جس میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے علم اور اس کی حفاظت کے بارے میں بتایا گیا ہے [کوشش کے باوجود یہ حدیث بھی ہمیں ذخیرۂ کُتبِ احادیث میں نہیں ملی] اور جس سے دوات ساتھ رکھنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہدِ حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل
خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام
ڈاکٹر اسرار احمدؒ
اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

میرے استاد - میرے محسن

ڈاکٹر حافظ ظفر احمد ☆

استاد کو معاشرے میں ایک خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ کہیں استاد کے لیے عدالتوں کے جج صاحبان کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہیں طلبہ و طالبات استاد کے زمین پر پڑنے والے سائے کا بھی احترام کرتے ہیں۔ یہ پیغمبری پیشہ ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ بھی سکھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔ والدین کے بعد استاد ہی وہ ہستی ہے جو اپنے شاگرد کو بہت اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔

میں استاد کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں جس نے میری آبیاری کی اور مجھے اس مقام پر پہنچنے کے قابل بنایا۔ میرا بچپن ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں جنڈیالہ شیر خاں میں گزرا۔ مجھے انتہائی شفیق استاد میسر آئے۔ پرائمری سکول میں مجھے میڈم فرخندہ، میڈم نجمہ، میڈم شمس، میڈم عذرا جیسے خلوص سے پڑھانے والے اساتذہ میسر آئے۔ اس کے بعد مجھے گاؤں کے ہی مدرسے میں حفظِ قرآن کے لیے داخل کروایا گیا اور وہاں بھی مجھے حافظ محمد سلیم اور قاری محمد اکرم جیسے محنتی استاد ملے۔ چار سال کے طویل عرصے میں حفظ قرآن کا معرکہ سر کرنے کے بعد مجھے ایک دفعہ پھر ہائی سکول کا رخ کرنا تھا۔ ہائی سکول میں میری تعلیم کا دورانیہ دو سال رہا اور پھر میں نے بطور پرائیویٹ طالب علم میٹرک کا امتحان دیا۔ ہائی سکول کے اس قلیل دورانیہ میں بھی مجھے محمد جمیل، ایاز اکبر، محمد عارف، سمیع اللہ، عطاء اللہ، شفیع محمد اور قاری محمد افضل جیسے اعلیٰ استاد میسر آئے، جنہوں نے مجھ سمیت سب طالب علموں کے لیے جاں فشانی سے محنت کی۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایک شہری اور بالکل نئے ماحول سے واسطہ پڑا۔ اس عظیم ادارے کے استاد بہت ہی عظیم تھے جنہوں نے مجھے اور میرے جیسے کئی اور دیہاتی بچوں کو خوش آمدید کہا اور ہمیں کسی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیلی کالج آف کامرس zafarahmad79@gmail.com

اس عظیم ادارے میں مجھے پروفیسر خان محمد چاولہ، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، پروفیسر ریاض احمد، پروفیسر صلاح الدین، پروفیسر اصغر ندیم سید جیسے زیرک استادوں سے پڑھنے کا موقع ملا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں میرا تعلیمی دورانیہ دو سال رہا اور اس عظیم ادارے سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہیلی کالج آف کامرس میں داخلہ لیا۔ یہاں میرا تعلیمی دورانیہ چار سال رہا اور اس دورانیہ میں بی کام اور ایم کام کی ڈگری حاصل کی۔ ہیلی کالج آف کامرس میں مجھے پروفیسر سعید احمد، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر تصدیق، پروفیسر احسان ملک، پروفیسر ظہیر احمد بٹ، پروفیسر فدا حسین بخاری، پروفیسر محمد معظم مغل، پروفیسر اعجاز احمد، پروفیسر عبدالرحیم، پروفیسر سید محمد نعیم اور پروفیسر عاصم زیدی جیسے عظیم استادوں سے کسب فیض کا موقع ملا۔

یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران ڈاکٹر ذوالفقار علی، ڈاکٹر انیس اسلم، ڈاکٹر زاہد احمد، ڈاکٹر دل محمد ملک، ڈاکٹر محمد انور جیسے قابل استادوں اور محققین کے زیر سایہ رہنے کا موقع ملا۔

میں اپنے تمام اساتذہ کرام کا ممنون ہوں اور دل کی انتہائی گہرائیوں سے ان کو سلام پیش کرتا ہوں اور ان عظیم لوگوں کے لیے ہمہ تن دعا گو ہوں کہ اللہ ربّ العزت ان کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں نصیب فرمائے۔

میرے ان تمام عظیم استادوں میں تین ہستیاں ایسی ہیں جنہیں میں استاد سے بھی اوپر سمجھتا ہوں اور میرا یہ یقین ہے کہ میری تمام تر کامیابیوں میں ان تین اساتذہ کی راہنمائی اور دعائیں میرے ساتھ رہیں۔ ان تین ہستیوں کا ذکر بصد احترام کرنا اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔

میڈم فرخندہ اشرف میری پرائمری سکول کی استاد تھیں۔ میڈم فرخندہ شادی کے کچھ سال بعد اپنی جوانی میں اس وقت بیوہ ہوگئیں جب ان کے شوہر ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میڈم فرخندہ کی دو بیٹیاں شازیہ اشرف اور نوشابہ اشرف تھیں۔ شازیہ باجی بعد میں ڈاکٹر جبکہ نوشابہ باجی سکول ٹیچر بنیں۔ میڈم فرخندہ نے اس سانحے کو بڑی بہادری سے برداشت کیا اور اپنی ساری زندگی اپنی بیٹیوں اور گاؤں کے بچوں کے لیے وقف کر دی۔ میڈم فرخندہ گاؤں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھیں جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن گاؤں کے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میں پرائمری سکول میں پہلے ہی دن سے میڈم فرخندہ کے زیر سایہ رہا۔ وہ نظم و ضبط میں اپنی مثال آپ تھیں۔ میں نے اپنے پورے تعلیمی

کیریئر میں میڈم فرخندہ جیسا نڈر' بے باک' بااعتماد' پُرخلوص اور خوددار شخص نہیں دیکھا۔ نپی تلی اور بامعنی بات کرنا ان کی عادت تھی۔ گاؤں میں کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان سے اونچی آواز میں بات کرتا۔ گاؤں کے تمام بزرگ انہیں بیٹی کہتے ہی نہیں بلکہ سمجھتے بھی تھے۔ گاؤں کے تمام بڑے ان کو بہن اور بچے ماں سمجھتے تھے اور ان کا کردار حقیقتاً ماں' بہن اور بیٹی کا ہی تھا۔ مجھے بیٹا کہتی اور سمجھتی تھیں اور مجھے بھی ہمیشہ ان سے ماں والی خوشبو آتی تھی۔ یہ ساری عزت ان کے بلند کردار کی وجہ سے تھی۔ صبح سکول میں سب سے پہلے آنے والی ہستی میڈم فرخندہ اور چھٹی کے بعد سب سے آخر میں سکول چھوڑنے والی ہستی بھی میڈم فرخندہ ہی تھیں۔ سکول میں مختلف ذاتوں کے بچے پڑھتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سکول میں آکر یہ بچے ہر قسم کی ذات پات سے مبرّا ہوتے تھے اور سب بچے میڈم فرخندہ کے بچے ہوتے تھے۔ یہ سکول بنیادی طور پر لڑکیوں کا سکول تھا اور پانچویں جماعت تک اسی سکول میں لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ میڈم فرخندہ کا یہ مشن تھا کہ سکول میں آنے والی ہر بچی کو سلائی کڑھائی' کھانا پکانا اور گھرداری آنی چاہیے۔ اسی لیے سکول میں سلائی کڑھائی اور خانہ داری کے مقابلے روٹین سے منعقد کروائے جاتے تھے۔ میڈم کا کہنا تھا کہ گھرداری سکھائے بغیر بچیوں کی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔

میں پانچویں جماعت تک میڈم فرخندہ کے زیرِشفقت رہا لیکن اس پانچ سالہ عرصہ نے میرا ان کے ساتھ ساری عمر کا رشتہ قائم کر دیا تھا اور میں آج بھی اس رشتے کو اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔ لاہور سے جب بھی گاؤں جانا ہوتا تھا تو میڈم سے ملنا لازم ہوتا تھا۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ان کی صحت کا گراف نیچے گر رہا تھا لیکن ان کے ساتھ ملاقات میں یہ بات شدت سے محسوس کرتا تھا کہ ان کے خلوص اور اعتماد میں کوئی کمی نہیں آئی اور ان کی آواز میں رعب اور دبدبہ اسی طرح عیاں تھا جیسے کئی سال پہلے تھا۔ ان سے ملاقات کے بعد یوں لگتا تھا کہ میں دعاؤں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ میڈم فرخندہ ایک خوبصورت اور انتہائی مثبت زندگی گزارنے کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملیں اور مجھے اور میرے جیسے بہت سے شاگردوں کو سوگوار چھوڑ گئیں۔ میں آج بھی ان کی کمی اپنی زندگی میں ایسے ہی محسوس کرتا ہوں جیسے اپنی ماں جی کی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور قدم قدم ان کے درجات بلند کریں۔

پرائمری سکول کے بعد مجھے حفظ کے لیے گاؤں کے ہی ایک مدرسے میں داخل کروایا گیا۔

میں نے چار سال کے عرصے میں قرآن پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنا تھا اور یہ ایک چیلنج سے کم نہ تھا' کیونکہ میرے پرانے کلاس فیلوز دسویں جماعت میں جا رہے تھے اور مجھے چھٹی جماعت میں داخلہ لینا تھا۔ گاؤں کے گورنمنٹ ہائی سکول میں مجھے چھٹی جماعت میں داخل کروایا گیا۔ یہاں میری ملاقات اسی سکول کے ایک درویش صفت استاد سے ہوئی۔ اس عظیم اور درویش صفت استاد کا نام محمد جمیل تھا۔ انتہائی سادہ' انتہائی مطمئن اور شفقت سے بھرپور اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اور میرے جیسے کئی اور طلبہ کے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہوا تھا۔ جمیل صاحب شیخوپورہ شہر سے میرے گاؤں میں پڑھانے آتے تھے۔ مجھے فرمانے لگے کہ تم سکول میں چھٹی جماعت میں پڑھا کرو اور اس کے بعد میرے پاس آ جایا کرو' میں تمہیں میٹرک کی تیاری کراؤں گا۔ میں نے اسی طرح کیا اور میری ایک بہت سخت روٹین شروع ہو گئی۔ صبح سے شام تک مجھے بمشکل ہی کوئی فارغ وقت ملتا تھا۔ جمیل صاحب کے پڑھانے کا طریقہ اسی قدر اچھا تھا کہ ان کی باتیں دل میں اترتی تھیں اور مجھے یہ مشکل وقت مشکل وقت لگتا ہی نہ تھا۔ جمیل صاحب کی بیٹھک طالب علموں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی۔ کوئی شفٹ سسٹم نہ تھا۔ طالب علم آتے جاتے اور اپنی باری پر اپنا سبق سناتے۔ نیا سبق لیتے اور چلے جاتے۔ سب طالب علموں کو ایک یا دو بار سبق ملتا تھا' لیکن حُفّاظ کے لیے باریوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی اور حفاظ کئی دفعہ سبق لیتے' کئی دفعہ سناتے اور جتنا چاہے وقت ان کے پاس گزارتے تھے۔

جمیل صاحب نے اپنا اصول بنایا ہوا تھا کہ وہ کسی حافظِ قرآن سے فیس نہیں لیتے تھے۔ اسی طرح مجھ سمیت کئی حفاظ بغیر فیس سالہا سال ان کے زیرِتعلیم رہے۔ باقی طالب علموں کی فیس بھی بہت معمولی تھی اور اس کا بھی کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ حُفّاظ کی فیس بھی نہ تھی اور ان کو ٹائم بھی زیادہ ملتا تھا۔ میں عینی شاہد ہوں کہ والدین جمیل صاحب سے اپنے بچوں کے لیے باصرار انفرادی وقت مانگتے تھے اور زیادہ سے زیادہ فیسیں دینے کے لیے بھی تیار ہوتے' لیکن جمیل صاحب معذرت کر لیتے اور کہتے کہ جس نے پڑھنا ہے سب کے ساتھ پڑھے۔ جمیل صاحب کی مصروفیت کا عالَم یہ تھا کہ صبح سے شام تک درس و تدریس میں اور بچوں کی اصلاح میں گزارتے اور ان کے پاس اپنے لیے کوئی وقت نہ ہوتا تھا۔ میں تین سال تک ان کے زیرِسایہ رہا۔ اس دوران میں نے یہ بات محسوس کی کہ جمیل صاحب اپنی سائیکل پر عصر کی نماز پڑھ کر نکلتے اور پھر مغرب کی نماز کے بعد واپس لوٹتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کسی گھر میں جا کر پڑھاتے ہوں

گے۔لیکن ایک دن میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں نے اپنی زندگی میں عصر سے مغرب تک کا وقت ایک مدرسے میں قرآن پاک حفظ کرنے والے بچوں کے لیے مختص کیا ہوا ہے۔اور پھر مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ یہ کام فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔اس عظیم استاد کی قرآن پاک سے محبت کا عالم دیکھیے کہ جو حافظ گھر میں پڑھنے آتے ان کو بھی بلا معاوضہ پڑھاتے اور جن حُفّاظ کے پاس خود چل کر جاتے ان کو بھی بلا معاوضہ پڑھاتے۔جمیل صاحب کی قرآن پاک سے محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگائیے کہ انہوں نے اپنے سارے بیٹے بیٹیوں کو قرآن پاک حفظ کروایا۔میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے جمیل صاحب جیسے عظیم استاد سے پڑھنے کا موقع ملا۔

میں تین سال جمیل صاحب کے زیرِتعلیم رہا اور یہ ان کی محنت کا ثمر ہے کہ میں نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا اور ضلع بھر میں آرٹس مضامین میں نمایاں پوزیشن کے ساتھ ساتھ میرٹ سکالرشپ حاصل کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور جیسے عظیم ادارے میں داخلے کا حق دار ٹھہرا۔میری اس کامیابی کا سہرا اس عظیم استاد کے سر ہے۔میں یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میری تمام تر کامیابیاں جمیل صاحب کی محنت اور دعاؤں کا ثمر ہیں۔

۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۴ء تک میں یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے زیرِتعلیم رہا۔مجھے یہاں پر انتہائی محنتی استاد ملے جنہوں نے میرے جیسے طالب علموں کو تحقیق کے میدان میں اتارا۔میں یہاں پر ایک استاد کا تذکرہ خاص طور پر کروں گا۔یہ ڈاکٹر ذوالفقار علی خاں صاحب تھے جنہوں نے ہمیں ریسرچ کا مضمون پڑھایا۔بڑی بارعب اور جلالی طبیعت کے مالک تھے۔اپنے مضمون پر مکمل عبور اور کلاس پر مکمل گرفت رکھتے تھے۔کلاس کو وقت پر شروع کرنا اور وقت پر ختم کرنا ان کا معمول تھا۔کلاس کے دوران کسی بھی غیرضروری گفتگو سے اجتناب کرتے تھے اور ضروری گفتگو کی حوصلہ افزائی کرتے۔طبیعتاً ایک سخت مزاج استاد تھے۔وہ اپنے لیے اور اپنے طالب علموں کے لیے بہت اونچے معیار رکھتے تھے اور ان کے معیار پر پورا اترنا کوئی آسان کام نہ تھا۔درس وتدریس میں تو ان کا نام تھا ہی لیکن ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ طالب علموں کو تحقیق کرنا سکھاتے تھے اور ان میں تحقیق کرنے کا جذبہ اور شوق پیدا کرتے تھے۔میری خوش قسمتی رہی کہ ڈاکٹر ذوالفقار علی خاں پہلے ایم فل میں اور پھر پی ایچ ڈی میں میرے سپروائزر مقرر ہوئے اور مجھے ان سے تحقیق کے علاوہ عملی زندگی کے لیے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ڈاکٹر صاحب کو کسی نقطے پر قائل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا' کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہر بات میں سے کوئی نیا نقطہ اٹھاتے اور

گفتگو کو آگے بڑھاتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے مجھے پورا حق دے رکھا تھا کہ میں ریسرچ میں ان کی کسی بھی بات سے اختلاف کروں۔وہ اس اختلاف کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب اپنے طالب علموں کا کام حرف بحرف چیک کرتے اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔غلطیوں کی نشاندہی کے انداز سے ان کی نوعیت پتہ چل جاتا تھا۔اگر کوئی جملہ ایک ہی دفعہ انڈر لائن ہوا ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ غلطی معمولی نوعیت کی ہے۔انڈر لائن کی شدت جس قدر زیادہ ہوتی اس سے پتہ چل جاتا کہ غلطی کس قدر سنجیدہ نوعیت کی ہے۔کئی دفعہ تو قلم کی سختی سے ورق ہی پھٹ جاتا۔میں آج بھی ڈاکٹر صاحب کی چیک کی ہوئی تحریریں دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے طالب علموں کے کام کو کس قدر سنجیدگی سے لیتے تھے۔

میں پانچ سال تک ڈاکٹر صاحب کے زیرِسایہ رہا اور اس سارے عرصے کے دوران میں نے ڈاکٹر صاحب کو بطور استاد اپنی رائے کو اپنے طالب علموں پر مسلّط کرتے نہیں دیکھا۔ہمیشہ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے کہ وہ اپنا نقطہ نظر بلا جھجک پیش کریں' اور اگر طالب علموں کا نقطہ نظر ٹھیک ہوتا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے ورنہ اس کی تصحیح فرماتے۔بلاشبہ ڈاکٹر صاحب ایک بڑے استاد اور اس سے بڑھ کر بڑے انسان تھے۔بطور استاد میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے طریقہ تحقیق اور طریقہ گفتگو کو اپنے طالب علموں تک منتقل کرسکوں' لیکن بلا مبالغہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے معیار کو حاصل کرنا ایک مشکل کام ہے۔

میرے یہ تینوں اساتذہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں' لیکن وہ مجھے اور میرے جیسے کئی اور طالب علموں کو اچھی زندگی گزارنے کا گر اور ایک اچھا استاد بننے کا طریقہ ضرور بتا گئے ہیں۔میں یہ بات بڑے مان اور خلوصِ نیت سے کہتا ہوں کہ میری زندگی میں جو کچھ اچھا ہے وہ میرے اساتذہ کی بدولت ہے اور جو کچھ اچھا نہیں ہے اس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔میں ہر سال اپنے ان اساتذہ کے نام کی قربانی کرتا ہوں اور ہمہ تن اللہ ربّ العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ میرے اساتذہ کے درجات بلند کرے اور انہیں بہشت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔میں اللہ ربّ العزت سے مزید دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اپنے اساتذہ کے لیے اور میرے طالب علموں کو میرے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔آمین!

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء: ایک خطرناک دھوکہ

ڈاکٹر محمد سرشار خان

دورِ حاضر میں مسلم اُمہ کو درپیش بڑے چیلنجز میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایسا نظریہ یا عقیدہ ہے جسے ماننے والا خالقِ کائنات کے وجود کا انکاری ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کو عالمِ کفر نے درسی کُتب، نشر و اشاعت اور وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کے ذریعے عالمِ اسلام میں اتنا پھیلا دیا ہے کہ اکثر پڑھے لکھے مسلمان بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس بے بنیاد نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر یا مذہبی حلقوں کی جانب سے اسلام پر اس خطرناک ملحدانہ جارحیت کا کوئی مؤثر دفاع نہیں کیا جا رہا۔ اس مضمون میں ہم ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

ڈارونزم یا نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) کیا ہے؟

انسان اپنے فطری تجسّس کے تحت ہمیشہ اس سوال کا جواب تلاش کرتا آیا ہے کہ کُرۂ ارض پر جاندار اشیاء کیسے وجود میں آئیں۔ اس سوال کے دو ہی ممکنہ جواب ذہن میں آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ سب کچھ خالق کائنات نے پیدا فرمایا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی اتفاقی حادثہ کے نتیجے میں زمین پر موجود غیر جاندار عناصر و مرکبات کے باہم ملنے سے زندگی کی سادہ شکل خود بخود وجود میں آ گئی، جو کروڑوں سال گزرنے کے بعد ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ مقام تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو قدیم ہندو اور یونانی فلسفہ میں زندگی کی پیدائش کے بارے میں عجیب و غریب بے سروپا باتیں ملیں گی جو کہ آج کے دور میں درخورِ اعتناء نہیں سمجھی جاتیں۔

موجودہ دور میں سب سے پہلے ۱۸۰۹ء میں ایک فرانسیسی عالم لامارک (Lamarck) نے پہلی بار نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ اس کے خیال میں حیوانی جسم میں ہونے والی معمولی تبدیلیاں یا خاصیتیں اگلی نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اس کے مطابق حصولِ بقا کے لیے زرافے کی گردن رفتہ رفتہ لمبی ہوتی گئی تاکہ وہ اونچے درختوں سے حصولِ غذا کر سکے، کیونکہ چھوٹی گردن

کے جانور نیچے سے سب کچھ چٹ کر جاتے تھے۔ تاہم یہ نظریہ جلد ہی دم توڑ گیا، کیونکہ جب بیسویں صدی کے وسط میں جینوم اور وراثت (Genetic and Heredity) کے قوانین دریافت ہوئے تو معلوم ہوا کہ جاندار کے ہر خلیہ (cell) کے مرکزہ (Nucleus) میں اس جاندار کے DNA کا ڈھانچہ موجود ہے جس میں اس جاندار کے بارے میں ساری اطلاعات درج ہوتی ہیں اور اگلی نسل میں منتقلی کے دوران اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ زرافے کی گردن اس کی تمام زندگی میں ایک دو انچ بڑھ بھی گئی تھی تو یہ خصوصیت اس کی اگلی نسل میں منتقل نہیں ہوگی۔

اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں ایک برطانوی ماہر طبیعی علوم چارلس ڈارون نے اپنی مشہور کتاب Origin of Species لکھی۔ اس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمام ذی حیات کی اقسام نے ایک ہی جدِ اعلیٰ سے نزول (descend) کیا۔ ڈارون کے مطابق کروڑوں سال پہلے مناسب سازگار ماحول میسر ہونے کی وجہ سے حادثاتی اور اتفاقی طور پر مادی عناصر کے باہم ملاپ سے پہلا خلیہ (living cell) یا جرثومہ پیدا ہو گیا اور آج حیوانات و نباتات کی تمام انواع (species) اس جرثومے سے ارتقاپذیر ہو کر کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ ڈارون نے مزید کہا کہ ان ذی حیات انواع نے کروڑوں سالوں کے دوران ماحول اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتے ہوئے بتدریج ارتقائی منازل طے کیں۔ ڈارون نے بقا کے سلسلہ میں قدرتی انتخاب پر زور دیا ہے۔ اس کے مطابق زندگی میں طاقتور کی ہی جیت ہوتی ہے۔ Survival of the Fittest یعنی جو مضبوط ہوگا اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے گا وہی باقی رہے گا۔

اب ہم ان علمی تنازعات پر بحث کریں گے جو ڈارون تھیوری یا نظریہ ارتقاء پر غور و فکر سے جنم لیتے ہیں۔ اس سے ہمیں علم ہوگا کہ یہ نظریہ کتنا بے بنیاد، باطل اور گمراہ کن ہے۔

کُرۂ ارض پر زندگی کا آغاز

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈارون نے اپنی کتاب میں زندگی کی ابتدا کے متعلق کوئی وضاحت پیش نہیں کی۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اپنے پیش کردہ نظریات کے ضمن میں ڈارون کے اپنے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے جن کا وہ اپنی زندگی میں کوئی ٹھوس مثبت جواب نہیں دے سکا اور اس نے اپنی ساری امیدیں آنے والے سائنس دانوں سے لگا دیں کہ ان کے

تجربات ومشاہدات اس کے نظریات کو تقویت دیں گے۔

ڈارون کی کتاب منظر عام پر آنے کے پانچ سال بعد ہی مشہور عالم ماہرِ حیاتیات لوئی پاسچر (Louis Pasteur) نے اپنی تحقیق وتجارب سے یک لخت خود بخود پیدائش کے دعویٰ کو غلط ثابت کر دیا جو کہ ڈارون تھیوری کی عمارت کا بنیادی پتھر تھا۔

آج کا سائنسدان جدید ٹیکنالوجی اور اعلیٰ ترین تجرباتی سہولیات کے باجود اپنی لیبارٹری میں ایک بھی زندہ خلیہ نہیں بنا سکا' بلکہ اب ایسی تمام کوششیں بند کر دی گئی ہیں۔

ڈارون کے مطابق پہلا زندہ خلیہ قدیم موافق ارضی ماحول کے زیر اثر اتفاقی طور پر وجود میں آ گیا تھا۔ اس بات پر ڈارون کے زمانے میں تو کچھ ناسمجھ لوگوں نے یقین کر لیا تھا' کیونکہ اس وقت خلیہ کی پیچیدہ ترین ساخت کا انسان کو علم نہیں تھا۔ یہ تو اب معلوم ہوا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی فیکٹری بھی کسی چیز کی تیاری کے سلسلے میں وہ افعال اتنی عمدگی اور کاملیت کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکتی جو ایک سادہ سے سادہ خلیہ میں ہمہ وقت جاری وساری رہتے ہیں۔ ڈبلیو ایچ تھارپ (W.H.Thorp) جو ایک ماہر ارتقاء ہے' اعتراف کرتا ہے کہ ''سب سے کم تر ابتدائی قسم کا خلیہ بھی ایسا نظامِ عمل رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ پیچیدہ مشین انسانی دماغ نے آج تک نہ سوچی اور نہ ہی بنائی ہے۔''

خلیہ کی مثال ایک بہت بڑے شہر کی ہے' جس کی اپنی فصیل ہے' آنے جانے کے راستے ہیں' جہاں سکیورٹی کا سخت انتظام ہے۔ انتظامیہ کا مرکزی کنٹرول روم ہے' جو شہر کی مختلف فیکٹریوں میں ہونے والی پیداوار کو کنٹرول کرتا ہے۔ توانائی پیدا کرنے کا اپنا نظام ہے حتیٰ کہ کچرا وغیرہ ٹھکانے لگانے کا زبردست سسٹم ہے۔ اپنا دفاعی' مواصلاتی اور نقل وحمل کا نظام بھی ہے۔ اندرونی معاملات کے علاوہ یہ شہر دوسرے شہروں سے بامقصد رابطے میں رہتا ہے اور پورے ملک یعنی جسم سے ملنے والے احکامات اور اطلاعات پر بھی عمل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اَن گنت دوسرے افعال ہیں جن پر تحقیق جاری ہے اور خلیہ کے اسرار ورموز سے پردے اٹھائے جا رہے ہیں۔ خلیہ تو خیر بہت بڑی چیز ہے' ایک خلیے کی تشکیل میں جو میٹیریل یا building blocks استعمال ہوتے ہیں اس کی ایک اینٹ بھی اتفاقیہ طور پر بننا محال ہے۔

خلیے کے بنیادی اجزاء میں لحمیات (proteins) ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑے بڑے سہ رخی سالمات (three dimensional molecules) ہیں جو مزید چھوٹے چھوٹے

یونٹس سے مل کر بنتے ہیں۔ ان واحدات (units) کو امینو ایسڈز (amino acids) کہتے ہیں۔ کُل ۲۲ قسم کے امینو ایسڈز ہیں جن کی مختلف ترتیب سے لاکھوں قسم کی پروٹین بنتی ہیں۔

سب سے سادہ مختصر پروٹین میں بھی ۵۰ کے قریب امینو ایسڈ ہوتے ہیں' جبکہ بعض پروٹین کے سالمے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان میں ہزاروں امینو ایسڈ ایک خاص ترتیب میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک امینو ایسڈ بھی غلط مقام پر اور غلط طریقے سے جڑ جائے تو پروٹین کی تمام ساخت بیکار بلکہ زندگی کے لیے ضرر رساں ہو جاتی ہے۔

ایک سادہ سی مثال لیں۔ ایک اوسط سائز کی پروٹین کے سالمے کو جس میں ۱۲ مختلف اقسام کے ۲۸۸ امینو ایسڈز ہوتے ہیں جنہیں 10^{300} مختلف طریقوں سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ان تمام ممکنات میں سے صرف ایک ترتیب سے ہی مطلوبہ پروٹین کا سالمہ بن سکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں۔ ۱۰ کے آگے ۳۰۰ صفر لگائیں اور پھر ان کی گنتی کریں۔ یہ بہت ہی بڑا عدد ہے۔ علم امکانیات کی رو سے 10^{50} سے زیادہ کی امکانیات عملی طور پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ صرف ایک پروٹین کا معاملہ ہے' جبکہ ایک خلیہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں پروٹین ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ خلیہ اتفاقی طور پر وجود میں آ گیا ہوگا' بعید از امکان ہے۔ یہ بات کئی ماہرینِ ارتقاء نے بھی تسلیم کی ہے۔ فزیالوجسٹ ہیرلڈ ایف بلم (Harold F.Blum) کہتا ہے: ''ایک مرکب پروٹین (polypeptide) کا یکلخت وجود میں آنا' خواہ وہ چھوٹی پروٹین ہی کیوں نہ ہو' ناممکن ہے۔''

نیویارک یونیورسٹی کے کیمیا کے پروفیسر اور DNA ایکسپرٹ رابرٹ شیفرڈ (Robert Shephard) کے مطابق ایک بیکٹیریم میں تقریباً ۲۰۰۰ اقسام کی پروٹین ہوتی ہیں (انسانی خلیہ میں دو لاکھ مختلف اقسام کی پروٹین ہوتی ہیں)۔ حساب کی رو سے ایک خلیہ بننے کا امکان ایک کے ہندسے کے بعد چالیس ہزار صفر لگانے کے برابر ہے۔ عملی حساب (Applied Mathematics) کے پروفیسر چندر وکرم سنگھ' جو ویلز کے کارڈف کالج میں نجوم وعلم الحساب کے استاد تھے' کے بقول ''یہ امکان کہ زندگی اچانک یک لخت بے جان مادوں کے ملنے سے بنی یا پیدا ہوئی' ڈارون اور اس کے نظریہ کو دفن کرنے کے لیے کافی ہے۔ کوئی ایسا قدیم محلول یا شوربہ اس زمین پر یا کسی اور سیارے پر (جس میں زندگی کی ابتدا ہوئی ہوتی) موجود نہیں۔ لہٰذا اگر زندگی اتفاقاً (at random) پیدا نہیں ہوئی تو ظاہر ہے کہ وہ

ایک بامقصد ذکاوفہم کا نتیجہ ہے۔''

سر فریڈ ہوئل ان ناممکن اور ناقابلِ یقین نمبروں کے حوالے سے کہتا ہے: ''درحقیقت یہ نظریہ کہ زندگی کسی ذکاوفہم اور بڑے عظیم فنکار کی تخلیق کا نتیجہ ہے' اس قدر معتبر اور واضح ہے کہ اس امر پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی معمولی بات لوگوں کو کیوں سمجھ نہیں آتی اور لوگوں میں مقبول کیوں نہیں ہوتی جبکہ وہ اپنی شہادت آپ ہے۔ اس عدم اعتراف کے اسباب علمی کی بجائے نفسیاتی زیادہ ہیں۔''

۱۹۹۹ء میں سائنس نیوز (Science News) کے جنوری کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا' جس کا لب لباب یہ تھا کہ ابھی تک کوئی ایسی تفسیر پیش نہیں ہوئی جو یہ واضح کر سکے کہ امینو ایسڈز کس طرح پروٹین میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دورِ قدیم میں تو متوقع حالات میں امینو ایسڈ بکھر گئے ہوتے اور ہر ایک علیحدہ ہوتا۔

امینو ایسڈز پر تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ پروٹین خواہ پودوں کی ہوں یا جانوروں کی' ان سب کی تعمیر میں صرف بائیں بازو کے امینو ایسڈز حصہ لیتے ہیں۔ (امینو ایسڈز کی ساخت کے حوالے سے دو اقسام ہیں جو ایک دوسرے کا آئینہ دار عکس (mirror image) ہیں۔ اگر پروٹین کی تشکیل کے دوران ایک بھی دائیں بازو والا امینو ایسڈ پروٹین کے جسم سے جڑ جائے تو وہ پروٹین فوراً ناکارہ/ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح Nucleotide (نیوکلیائی فاسفورس گروپ سے منسلک ایک نامیاتی مرکب) جو کہ Nucleic Acid, DNA, RNA کے متعلق ہے' اس میں پروٹین کے بالکل برعکس صرف داہنے ہاتھ کے امینو ایسڈ استعمال ہوتے ہیں۔ کیا درج بالا دونوں حقیقتوں کی ''اتفاق'' کے فارمولے سے تشریح کی جاسکتی ہے؟

برٹانیکا سائنس انسائیکلوپیڈیا وہ صریح کتاب ہے جو کھلم کھلا نظریہ ارتقاء کی پُرزور حامی ہے۔ وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کائنات میں سارے زندہ اجسام اور انہیں تعمیر کرنے والی پروٹین کے بلاک سب مرکب سالمات کے جڑنے سے بنے ہیں' ان سب میں بائیں بازو کی ترتیب موجود ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک سکّہ لاکھ مرتبہ اچھالا جائے اور ہمیشہ سر (head) ہی اوپر آئے۔ یہی انسائیکلوپیڈیا لکھتا ہے کہ ''یہ سمجھ میں آنا ناممکن نظر آتا ہے کہ آخر کیوں یہ سالمات بائیں بازو یا دائیں بازو والے ہو جاتے ہیں۔ جب زمین پر زندگی کی ابتدا کا

سوال اٹھتا ہے تو یہ سالماتی پسند ناپسند بے حد حیرت انگیز اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے۔''

معاملہ یہ ہے کہ اگر درج بالا واقعات اتفاقی نہیں ہیں اور ناممکنات میں سے ہیں' اس کے باوجود بھی وہ موجود ہیں' تو مان لینا چاہیے کہ اس کے پیچھے کسی زبردست معاملہ فہم حکیم یا غیبی طاقت کا ہاتھ ہے۔ لیکن اصل المیہ یہی ہے کہ جواب کتنا ہی واضح اور مدلّل کیوں نہ ہو' ڈارون کے پیروکار حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہی رہیں گے۔

ارضی کیمیا کے ماہر جیفری بارا' جن کا تعلق سان ڈیاگو کے سکرپس علمی ادارے سے تھا' علمِ ارتقاء کے مبلغوں کی ناکامی اور معذوری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: ''آج جب ہم بیسویں صدی کو چھوڑ رہے ہیں تو آج بھی ہمارا سامنا اسی مشکل سے ہے جو اُس وقت بھی ویسے ہی بغیر حل کے تھی جب ہم نے بیسویں صدی شروع کی تھی کہ زمین پر زندگی کس طرح وجود میں آئی۔'' اگر چند لمحوں کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا کوئی خلیہ اتفاقاً وجود میں آ گیا ہوگا تو ایک قانونِ قدرت (Thermodynamics) کے تحت چند دنوں یا ہفتوں بعد فرسودگی اور شکست و ریخت کا شکار ہو کر ختم ہو گیا ہوگا' کیونکہ خلیہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی نسل بڑھانے کے لیے خود بخود مزید پیدائش کا عمل شروع کر دے۔ اب اگر اسے بھی اتفاق کا نام دے دیں تو پھر اپنا سر ہی پیٹا جاسکتا ہے۔

چلیے یہ بھی مان لیتے ہیں۔ لیکن جب پہلا خلیہ تشکیل کے مراحل سے گزر رہا ہوگا اور پروٹین کا سالمہ بن بھی گیا ہوگا تو فضا میں موجود آکسیجن کی وجہ سے اس پروٹین کی تکسید (oxidation) ہو گئی ہوگی اور وہ ختم ہو گیا ہوگا۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے' لیکن مان لیتے ہیں کہ اُس وقت فضا میں آکسیجن (O_2) کی مقدار بھی بہت کم ہوگی' تو اس صورت میں فضا میں اوزون (O) کی مقدار بھی بہت کم ہوگی۔ فضا میں اوزون کی تہہ سورج کی الٹرا وائلٹ شعاعوں (ultra violet rays) کو زمین پر اترنے سے روکتی ہے۔ اس صورتحال میں وہ خلیہ ان شعاعوں کی زد میں آکر موت کے گھاٹ اتر گیا ہوگا۔

غرض ہم خلیہ کے افعال کے پیچیدہ' مربوط اور عظیم الشان ہونے کے جتنے چاہیں ثبوت دیں' دوسری طرف سے ''میں نہ مانوں'' کی رٹ لگی رہے گی۔ یہ نظریہ دورِ جدید میں عالمانہ سطح کی عظیم ترین ہٹ دھرمی اور تعصب کی بھیانک مثال ہے جو یورپ سے اُبھرنے والے سائنسی اور دیگر علوم کی صداقت پر بھی سوالیہ نشان بن گیا ہے' کیونکہ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کے دلائل

قدیم دیو مالائی کہانیوں کی طرح بودے اور مضحکہ خیز لگتے ہیں' جن کی کوئی علمی بنیاد نہیں' جبکہ سائنسی نقطہ نظر سے کسی نظریے کی حقیقت اور سچائی کا دارومدار اس سے متعلقہ تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء کسی پہلو سے بھی مروّجہ معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ پھر بھی اسے ایک سائنسی صداقت کے طور پر ایک منظم تحریک کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلایا جارہا ہے۔

میوٹیشنز (Mutations)

جب جدید علوم (Genetics & Heredity) کی بنیاد پر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی کہ ارتقاء بذریعہ قدرتی انتخاب (Evolution through Natural Selection) ناممکن ہے تو ڈارونزم کے حامیوں نے اس مردے میں نئی روح پھونکنے کے لیے ۱۹۴۱ء میں امریکی علوم طبقات الارض (GSA) کے زیر اہتمام ایک انٹرنیشنل کانفرنس بلائی۔ ان علماء و سائنس دانوں نے جینومی پائیداری (Genetic Stability) کے توڑ کے لیے ''میوٹیشن'' کی اصطلاح ایجاد کی۔ ان کے نزدیک میوٹیشن ایسا جینیاتی عمل ہے جو اگلی نسل میں منتقل ہوکر توراثی تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے۔ ہم ایسے بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ پیدائشی جسمانی ''نقائص'' ہیں جو تابکاری اور دیگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر اگلی نسل میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ اچانک تبدیلیاں خلیہ یا والدین کے genetic code میں درج معلومات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ اسے بنیاد بنا کر اس نظریے کو آگے بڑھایا گیا کہ ارتقائی عمل میوٹیشنز کے ذریعے زندہ اشیاء میں مفید تبدیلیوں کی بنا پر آگے بڑھا۔

دور جدید میں اس کی بھی واضح تردید ہوگئی ہے' کیونکہ میوٹیشن سے کبھی بھی مفید تبدیلیاں وجود میں نہیں آئیں اور نہ ہی یہ عمل اتنا عام ہے کہ وسیع پیمانے پر ہو' ورنہ ہر زندہ چیز ان تبدیلیوں کے ذریعے (جو ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں) تباہ ہوجاتی۔

میوٹیشنز کا اثر کوئی ناگاساکی' ہیروشیما اور چرنوبل کے متاثرین سے پوچھے جو خوفناک جسمانی نقائص کے ساتھ پیدا ہوکر موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس کے ''مفید اثرات'' کا اس کسان سے بھی پوچھا جاسکتا ہے جس کے باڑے میں پانچ ٹانگوں والے بچھڑے یا دوسروں والے میمنے کی پیدائش ہوئی ہو۔ دراصل ہر خلیے کے مرکز میں DNA کا ڈھانچہ اتنا منظم اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی بے ترتیبی اور بے تکی تبدیلی اسے صرف نقصان ہی پہنچا سکتی ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ لیبارٹری میں میوٹیشنز کے ذریعے تبدیل شدہ زندہ اجسام اکثر بانجھ ہوتے ہیں اور ذہنی وجسمانی عوارض کا شکار ہوکر جلد ہی مرجاتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ میوٹیشن کے ذریعے تبدیلیاں اگلی نسل تک نہیں پہنچ پاتیں۔ سائنسی جریدہ Science (۲۰۱۷ء) میں کہا گیا کہ DNA میں بے ترتیب جینیاتی تبدیلیاں جن کا وراثت یا ماحولیاتی عوامل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' وہ انسانی خلیات میں دو تہائی کینسر کا باعث بنتی ہیں۔ گویا میوٹیشن مفید ہونے کی بجائے ایک تباہ کن عمل ہے۔

نظریہ کی مشکلات (ڈارون کی کتاب کا ایک باب)

خود ڈارون لکھتا ہے ''اگر ان سب جانداروں کی انواع (species) دوسری انواع سے بے حد نفیس اور تدریجی مدارج الاارتقاء سے اس منزل تک پہنچی ہیں تو پھر ہمیں قدم بہ قدم اور ہر جگہ لاتعداد عبوری اشکال (ایک نوع کے دوسرے نوع میں تبدیل ہوتے ہوئی درمیانی شکلیں /اجسام) ملنی چاہئیں' لیکن اس کے برعکس ہر جاندار نوع بے حد مکمل اور واضح ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ نظریہ ارتقاء کے مطابق تو لاتعداد عبوری شکلیں لازماً موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ وہ ہمیں طبقات الارض کی پرتوں میں کیوں نہیں ملتیں؟ یہ ایسی مشکل تھی جس نے طویل عرصے تک مجھے حیران و پریشان رکھا۔''

اس مشکل سوال کا وہ خود جو جواب دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ابھی تک دریافت ہونے والے حجری آثار (fossils) کا ریکارڈ نامکمل اور ناکافی ہے۔ اس کے مطابق جب یہ ریکارڈ مکمل ہو جائے گا تو ان میں گمشدہ درمیانی کڑیاں ضرور مل جائیں گی۔ اس طرح ڈارون نے اپنے نظریے کی سچائی کا سارا دارومدار مستقبل میں دریافت ہونے والے فاسلز سے ملنے والے متوقع ثبوتوں پر رکھ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''اگر میرا نظریہ صحیح ہے تو یہ فاسلز ضرور ملیں گے''۔ ڈارون کی بدقسمتی کہ اب تک لاکھوں حجری آثار دریافت ہوچکے ہیں' لیکن ان سے ڈارون کے نظریے کو تقویت کی بجائے نقصان ہی پہنچا ہے۔

ڈارونزم: منکرینِ خدا کا بدعقیدہ

حیرت ہے کہ جس نظریے کے متعلق ڈارون خود بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا اس کی اشاعت وتبلیغ ایک منظم انداز میں بڑے شدومد کے ساتھ ایک مسلّمہ سائنسی حقیقت کے طور پر

مسلسل جاری ہے‘ حالانکہ اسے ہر علمی اور عقلی محاذ پر شکست کا سامنا ہے۔

ڈارون کو یہ بات بھی پریشان کرتی رہی کہ مرکب پیچیدہ جسمانی اعضاء مثلاً آنکھ‘ کان وغیرہ خودبخود اتفاقیہ مثبت تبدیلیوں سے کیسے وجود میں آ گئے اور تبدیلی یا ارتقاء کے کروڑوں سالوں پر محیط دَور کی کوئی درمیانی نامکمل اشکال کیوں نہیں ملتیں؟ پھر ان تبدیلیوں کے ساتھ یعنی ادھورے اعضاء کے ساتھ وہ زندہ کیسے رہے؟ مثلاً مکمل آنکھ بننے تک یہ جانور کیسے دیکھتے تھے یا نہیں دیکھتے تھے تو زندگی کیسے گزارتے تھے؟ اسی طرح ایک ڈائنوسار مکمل پرندہ بننے تک اپنے نامکمل پَروں کے ساتھ کیسے پرواز کرتا رہا؟ یا وہ ڈائنوسار اپنے اگلے نامکمل ہاتھوں (نامکمل پروں) کی وجہ سے کیسے چلتا تھا اور شکار کرتا تھا؟

ڈارون نے ۳/اپریل ۱۸۶۰ء کو اپنے دوست آسا گرے کو لکھے خط میں اعتراف کیا: ’’وہ وقت مجھے خوب یاد ہے جب آنکھ کی بناوٹ کا خیال مجھے سرتاپا سرد کر دیتا تھا۔ لیکن پھر میں نے اس مشکل پر قابو پالیا‘‘ (کس طرح قابو پایا یہ کہیں بیان نہیں ہوا)۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے: ’’......لیکن اب ایک معمولی اور بے قدر چیز یا ساخت مجھے اکثر بے چین کر دیتی ہے اور وہ ہے مور کی دم کے پر۔ جب میں ان کو دیکھتا ہوں تو یہ چیز مجھے بیمار کر دیتی ہے۔‘‘

’’بقائے اَصلح‘‘ یا قدرتی انتخاب

ڈارون کے اصول ’’بقائے اَصلح‘‘ (Survival of the fittest) کو دیکھا جائے تو زمین پر کمزور جانوروں کا وجود ختم ہو جانا چاہیے‘ لیکن ایسا نہیں ہے۔ گہرے اندھیرے سمندر میں ایک نابینا مچھلی پائی گئی ہے جو سونار (ریڈار) اور برقی سگنلز کے ذریعے دیکھنے اور شکار کرنے والی دیگر مچھلیوں کے ساتھ لاکھوں سالوں سے رہتی آ رہی ہے۔ نابینا سانپ ایک قسم کی چھپکلی ہے جس کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ اس مخلوق کی زندگی مشکلات سے پُر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نہ تو یہ معدوم ہوئی ہے نہ ہی ارتقا پذیر ہو کر چھپکلی بن گئی ہے۔ اسی طرح آسٹریلیا میں پایا جانے والا ایک سیہ (خار پشت) کنگرو کی طرح ایک تھیلی میں بچے کی پرورش کرتا ہے۔ یہ اپنے جسم میں اب تک کیوں تبدیلی نہیں لا سکا کہ دیگر خارپشتوں کی طرح آرام سے بچوں کو جنم دے سکے۔ دراصل اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی مصلحت کے تحت جو چیز جیسی بنائی ہے‘ وہ ویسے ہی موجود ہے۔ اس میں خودبخود کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

حجری آثار (fossils) کیا ہیں؟

لاکھوں کروڑوں سال پہلے مرے ہوئے اجسام/ آثار جو ہمیں زمین کی تہوں میں دبے ہوئے ملتے ہیں انہیں ’’فاسلز‘‘ (حجری آثار) کہا جاتا ہے۔ فاسلز کئی طریقوں سے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ زیادہ تر اس وقت تشکیل پاتے ہیں جب پودے یا جانور کسی آبی ماحول میں دریا یا سمندر کنارے کیچڑ یا مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں۔ ان کے نرم اجزاء تو گل سڑ جاتے ہیں‘ لیکن سخت حصے مثلاً ہڈیاں‘ سیپیاں‘ گھونگھوں کے خول وغیرہ وقت کے ساتھ ساتھ اوپر جمی مٹی اور ریت کی پَرتوں اور سخت دباؤ سے کروڑوں سالوں کی ارضی تبدیلیوں کی بنا پر پتھر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں‘ جو زلزلوں اور دیگر ارضیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے سطح زمین پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ پتھر کا کوئلہ فاسلز کی عام مثال ہے جو کروڑوں سال پہلے درختوں کے زیر زمین دفن ہونے کی بنا پر وجود میں آیا۔

ڈارون کے علاوہ معروف ماہر فاسلز فرانسس پیا ال گراس کہتا ہے ’’علم طبیعیات کے ماہرین کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ارتقاء کے مراحل صرف فاسلز کی اشکال سے ہی ثابت کیے جا سکتے ہیں اور علم آثارِ حجری ہی ارتقاء اور اس کے قدم بقدم مرحلہ وار جزوی مراحل پر روشنی ڈال سکتا ہے۔‘‘ اصل صورتحال یہ ہے کہ اب تک کروڑوں کی تعداد میں فاسلز تمام دنیا سے دریافت ہو چکے ہیں‘ جن میں سے اڑھائی لاکھ اقسام پہچان لی گئی ہیں۔ ان میں سے ڈیڑھ لاکھ شناخت شدہ اقسام اب بھی دنیا میں آباد ہیں۔ ان میں ایک لاکھ کے قریب کیڑے مکوڑے ہیں جو آج بھی اسی حالت اور شکل وصورت میں موجود ہیں جیسے کروڑوں سال پہلے تھے۔

رابرٹ کیرول جو علم ارتقاء پر حرفِ آخر ہیں‘ اپنی ایک تصنیف میں رقمطراز ہیں: ’’حالانکہ آج کل لاتعداد جانوروں کی انواع اسی دنیا میں آباد ہیں مگر وہ ذرّہ برابر بھی درمیانی چیز پیش نہیں کرتیں جو متمیز بھی ہو۔ اس کے برعکس وہ سب کے سب (بحیثیت ایک مکمل نوع کے) پہچانے جا سکتے ہیں۔‘‘

اور نائلز ایلڈرج معروف امریکی ماہر طبقات الارض ہے۔ وہ ڈارون کے دعووں کی غیر موزونیت اور بودے پن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ’’تمام فاسلز ریکارڈ ثابت کرتے ہیں کہ ارتقاء کے حوالے سے کوئی عبوری شکلیں اور درمیانی کڑیاں موجود نہیں ہیں۔‘‘

جیفری لونسٹون نے حجری آثار کے حوالے سے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ’’کوئی خاص

چیز اور بے حد مخفی و باطنی مگر بے حد تخلیقی قوت موجود ہے جو اس عمل کی ذمہ دار ہے۔‘‘

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ بار بار کائنات اور اس کی مخلوقات میں غور وفکر کا حکم دیتے ہیں‘ کیونکہ اس غور وفکر کے بعد انسان اسی نتیجے پر پہنچتا ہے جس پر ہر صاحبِ علم اور باشعور انسان کو پہنچنا چاہیے کہ یہ سب کچھ خود بخود نہیں بن گیا۔ اس کے پیچھے کوئی بے حد عظیم تخلیقی قوت موجود ہے۔ قرآن تو خود اس سلسلے میں انسان کو چیلنج دیتا ہے:

﴿قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ۝۳۴﴾ (یونس)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے دریافت فرمایئے تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے جو پہلی بار تخلیق کی ابتدا کرے پھر دوبارہ بھی پیدا کرے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا فرمائے گا۔ پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟‘‘

پھر خالق کائنات پیدا کر کے اس سے غافل نہیں ہو جاتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ۝۱ الَّذِىۡ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝۲ وَالَّذِىۡ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝۳﴾ (الاعلیٰ)

’’پاکی بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت بلند مرتبے والا ہے۔ اس نے سب کچھ (نہ صرف) پیدا کیا بلکہ اسے بالکل صحیح سالم اور مکمل بنایا۔ اور جس نے (ہر شے کا) اندازہ مقرر کیا‘ پھر اسے (فطری) ہدایت عطا فرمائی۔‘‘

سورۃ السجدہ میں یہی بات یوں فرمائی گئی:

﴿اَلَّذِىۡۤ اَحۡسَنَ كُلَّ شَىۡءٍ خَلَقَهٗ﴾ (آیت ۷)

’’جس نے ہر چیز جو بنائی خوب بنائی!‘‘

کائنات کی تمام اشیاء میں انتہائی درجہ کی موزونیت اور تناسب یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی اتفاقی حادثے سے وجود پذیر ہونے والی اشیاء میں یہ ترتیب اور حسن وسلیقہ کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو پھر چیلنج کرتے ہیں کہ:

﴿الَّذِىۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰى مِنۡ فُطُوۡرٍ ۝۳﴾ (الملک)

’’(اللہ وہ ہے) جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ (تو اے دیکھنے والے) تو اللہ رحمٰن کی تخلیق کردہ چیزوں میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔ دوبارہ (نظریں ڈال

کر) دیکھ لے‘ کیا کوئی شگاف بھی نظر آ رہا ہے؟‘‘

یعنی کہیں بھی کوئی بے ترتیبی اور بدنظمی نظر نہیں آئے گی‘ تم خواہ کتنی ہی جستجو کر لو۔ اگلی آیت میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ ۝۴﴾

’’پھر دہرا کر دو دوبار دیکھ لے‘ تیری نگاہ تیری طرف ذلیل (و عاجز) ہو کر تھکی ہوئی لوٹ آئے گی۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے تو کارِ تخلیق کچھ مشکل نہیں ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَوَلَيۡسَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰى ۚ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ۝۸۱ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝۸۲﴾ (یٰسٓ)

’’تو کیا جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو‘ وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسی مخلوق دوبارہ پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! جب کہ وہ تو بہت تخلیق فرمانے والا‘ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کی جب وہ کسی شے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ اسے کہتا ہے ہو جا تو بس وہ ہو جاتی ہے۔‘‘

چوپایوں کا ظہورِ اوّل

ڈارون کے نظریے کے تحت چوپائے سمندر یا پانی میں رہنے والے جانور تھے جو مچھلی سے ارتقا پذیر ہو کر خشکی پر آ کر رہنے لگے۔ لیکن فزیالوجی اور اناٹومی کے علوم اس کی تصدیق نہیں کرتے اور نہ ہی فاسلز ریکارڈ اس سلسلے میں کوئی شہادت فراہم کرتا ہے۔ فاسلز کے ریکارڈ کے مطالعے سے تو دو اہم باتیں واضح ہوتی ہیں:

☆ کسی ذی حیات کی نوع میں اس کی لاکھوں کروڑوں سال کی پوری زمینی زندگی میں (اس نسل کے نابود ہونے تک یا آج تک اگر وہ موجود ہے) کوئی جسمانی تبدیلی نہیں آئی۔

☆ کوئی بھی جاندار جنس آہستہ آہستہ وجود میں آ کر مکمل نہیں ہوئی بلکہ وہ تمام اجناس سب کی سب ہر لحاظ سے مکمل صورت میں ایک ہی دور میں یک دم پیدا ہوئیں۔

مچھلی کو تو زمین پر بود و باش اختیار کرنے کے لیے اپنے جسم اور افعال میں بہت تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔ سب سے پہلے تو نظامِ تنفّس کو تبدیل کر کے اسے گل پھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں

میں بدلنا ہوگا۔ اسے اپنے کمزور fins طاقتور ہاتھ پاؤں یا ٹانگوں میں بدلنا ہوں گے' تاکہ خشکی پر اپنا بھاری جسم اٹھا کر چل پھر سکیں (پانی میں تو انہیں چلنے میں کوئی دقت نہیں تھی)۔ اس کے علاوہ مچھلی کو اپنے اندرونی اعضاء اور ان کے کام کرنے کے طریقوں کو بھی بدلنا پڑے گا' کیونکہ سمندری خوراک و ماحول میں اور زمینی خوراک و ماحول میں بہت فرق ہے۔ سب سے ضروری یہ کہ اس کی جلد کو بھی خاصی تبدیلی کی ضرورت ہوگی تاکہ پانی کے ضیاع کو روکا جاسکے۔ فالتو مواد کے اخراج کے لیے اسے گردوں کی بھی ضرورت ہوگی جو کہ پہلے نہیں تھی' وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ سب ضرورتیں پوری نہ ہوں تو مچھلی خشکی پر چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔

اب اس کے دفاع میں بے سروپا کہانیاں ہی گھڑی جاسکتی تھیں جو گھڑی گئیں' اگرچہ وہ سب بے بنیاد اور غیر منطقی ہیں۔ قبل از وقت تغیّر (preadaptation) کی کہانی بھی گھڑی گئی اور کہا گیا کہ ابھی یہ مچھلیاں پانی میں ہی تھیں تو انہوں نے قبل از وقت وہ خدوخال حاصل کر لیے جن کی انہیں خشکی پر ضرورت پڑنے والی تھی۔ لیکن اس بات کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ وہ خاصیتیں اور خدوخال جن کی انہیں زمین پر زندگی گزارنے کے لیے ضرورت تھی' ان کے ساتھ انہوں نے اتنا عرصہ سمندر میں کیسے گزارا' کیا یہ Survival of the fittest کے اصول کے خلاف نہیں تھا؟ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں تو انہیں بہت جلد نیست و نابود ہو جانا چاہیے تھا۔

اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ مینڈک اور salamandar (کیچڑ میں رہنے والا ایک مچھلی نما جانور) کی مثال دیتے ہیں کہ یہ درمیانی شکلیں ہیں۔ لیکن ان جانداروں کے کروڑوں سال پرانے فاسلز اور موجودہ مینڈک اور salamandar کے جسم میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ یہ درمیانی کڑی تو نہ ہوئی۔ انہیں پیدا ہی ایسے کیا گیا تھا۔ اسی طرح کروڑوں سال پہلے سے موجود چمگادڑ کے فاسلز آج کل کی چمگادڑ سے سو فیصد مماثلت رکھتے ہیں۔ دودھ دینے والے جانوروں میں تو خشکی کے علاوہ ہوا میں اڑنے والی چمگادڑ اور پانی میں رہنے والی ڈولفن اور وہیل مچھلی بھی شامل ہیں' جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان مختلف گروہوں کا آپس میں دور دور تک کوئی ارتقائی تعلق نہیں ہے۔

مچھلی کے ایک فاسل کا قصہ

مچھلی کے ایک فاسل کے متعلق دعویٰ کیا گیا کہ اس کی نسل سات کروڑ سال پہلے ناپید ہو چکی ہے۔ اسے سیلاکانتھ (Cealacanthies) کا نام دیا گیا۔ اس کے بارے میں کہانی

گھڑی گئی کہ اس قدیم مچھلی کا گل پھڑوں کے علاوہ ایک پھیپھڑا بھی ہے جو کامل کام نہیں کر رہا' لہٰذا اسے مچھلی کے خشکی کی طرف انتقال کرنے کی درمیانی کڑی قرار دیا گیا۔

لیکن ہوا یوں کہ ۱۹۳۸ء میں بحر ہند سے اس نوع کی ایک زندہ مچھلی پکڑی گئی۔ اس کے تفصیلی مطالعے سے ارتقائی علماء کی برادری کو بہت گہرا صدمہ ہوا۔ اصل میں یہ مچھلی کی ایک قسم ہے جو گہرے سمندر کی باسی ہے اور عموماً سطح سمندر سے ۱۸۰ میٹر سے اوپر نہیں آتی۔ سیلاکانتھ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس کے نہ تو قدیم پھیپھڑے تھے اور نہ ہی بڑا دماغ تھا۔ جسے وہ پھیپھڑے سمجھتے رہے وہ ہوا کی تھیلی تھی جو مچھلیوں کو تیرنے میں مدد دیتی ہے۔ یوں اس مچھلی کو درمیانی کڑی قرار دینے کا دعویٰ غلط ثابت ہوگیا۔

دودھ دینے والے جانوروں کی پیدائش

نظریہ ارتقاء کے مطابق کچھ جانور سمندر سے نکلے اور رینگنے والے چوپائے (Reptiles) بن گئے اور یہ کہ ان ریپٹائلز (مثلاً چھپکلی' مگرمچھ' قدیم ڈائنوسارز) سے پرندوں نے جنم لیا۔

یہاں ایک سوال یہ بھی اُبھرتا ہے کہ سمندری جانداروں کو اپنی افزائش نسل کے لیے الگ طرز کا نظام درکار ہے۔ جب یہ جاندار خشکی پر آئے تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ان کے جنسی ملاپ' بارآوری کے طریقوں' انڈے کی ساخت کی تبدیلی خودبخود اس طرح واقع ہوگئی کہ ان کی افزائش نسل پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ جہاں تک ریپٹائلز کے دودھ دینے والے جانوروں میں تبدیل ہونے کا تعلق ہے یہ ناممکن بات ہے' کیونکہ ان دو اقسام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ریپٹائلز ٹھنڈے خون والے جاندار (cold blooded animals) ہوتے ہیں' یعنی یہ اپنے جسم کی گرمی خود کنٹرول نہیں کر سکتے۔ ان کے جسم کا درجہ حرارت بیرونی ماحول کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ یہ انڈے دیتے ہیں' اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتے اور ان کے جسم پر بالوں کی بجائے کھپرے (scales) ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس دودھ دینے والے جانور یعنی ممالیہ (mammals) اپنے جسم کو ایک خاص درجہ حرارت پر رکھنے کے لیے خود حرارت پیدا کرتے ہیں اور کنٹرول کرتے ہیں۔ انڈوں کی بجائے بچے پیدا کرتے ہیں اور انہیں دودھ پلاتے ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک ریپٹائل اپنا جسمانی درجہ حرارت خود کنٹرول کرنے لگا؟ حرارت کنٹرول کرنے کے لیے پسینے کا پیچیدہ نظام کس طرح پیدا ہوگیا؟ اس کے کھپرے کس طرح بالوں میں تبدیل ہوگئے۔ پھر پیچیدہ اور زبردست اندرونی تبدیلیاں کس طرح خودبخود

پیدا ہوگئیں کہ وہ انڈوں کی جگہ بچے دینے لگے؟ پھر ان کے تھن بھی نکل آئے اور وہ دودھ بھی دینا شروع ہوگئے۔ ان کے جبڑوں اور کانوں کی ہڈیوں میں کس طرح تبدیلیاں ہوگئیں؟ مزید برآں آج تک ایک بھی ایسا فاسل دریافت نہیں ہوا جو رپٹائل سے میمل تک کے سفر کے کسی ایک معمولی سے مرحلے کی بھی تائید و وضاحت کرتا ہو۔

پرندوں کی تخلیق

نظریہ ڈارون کے مطابق پرندے دورِ قدیم کے رپٹائلز یا ڈائنوسارز سے ارتقا پذیر ہو کر موجودہ حالات تک پہنچے ہیں۔ ابتدائی پرندوں میں اڑنے کی صلاحیت بہت کم تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مخصوص حالات کے زیر اثر ان کی موٹی کھپروں والی جلد پر پَر نکل آئے اور اگلی ٹانگیں اُڑنے والے پنکھوں میں تبدیل ہوگئیں۔ یہ خیال کسی سائنسی نظریے کی بجائے بچوں کو سنانے والی کوئی دلچسپ کہانی ضرور لگتا ہے۔

ماہرینِ ارتقاء اس سوال کا ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے کہ رفتہ رفتہ تبدیلی کے دور میں پرندے ادھورے پروں اور ادھوری اگلی ٹانگوں کے ساتھ معذوروں جیسی زندگی کیسے گزارتے ہوں گے؟ ادھورے پروں / ٹانگوں کے ساتھ نہ تو اُڑا جا سکتا ہے اور نہ شکار کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں تو خود ڈارون کے قدرتی انتخاب کے نظریے کے مطابق یہ ادھورے جانور جلد ہی نیست و نابود ہو گئے ہوں گے۔ سو یہ محض خیال قیاس آرائیاں ہیں جنہیں خباثت، ڈھٹائی اور تسلسل کے ساتھ ذہنوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔

ییل (Yale) یونیورسٹی کے شعبہ علم طبقات الارض کے ڈین پروفیسر جون اسٹروم اس ضمن میں کہتے ہیں کہ ابھی تک مکمل پرندہ بننے کی کوئی بھی حجری شہادت نہیں ملی۔ مکمل پرندہ بننے سے پہلے pro-aves کا نظریہ محض مفروضہ ہے۔ اس کے باوجود جو کہہ دیا گیا وہی صحیح ہے۔ یعنی ہم ڈارونزم پر پھر بھی یقین رکھتے ہیں۔ جبکہ ایک عام ذہن رکھنے والا آدمی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ پرندوں کے بازوؤں اور پروں کا پیچیدہ، بے حد مکمل ڈیزائن اور نظام خود بخود ارتقائی مدارج طے کر کے وجود میں آ گیا ہو۔

مزید برآں پرندوں اور رپٹائلز / ڈائنوسارز کی جسمانی ساخت اور طبعی افعال میں بھی بے حد فرق ہے۔ مثلاً:

☆ ڈائنوسارز کی ہڈیاں بہت بھاری اور ٹھوس تھیں، کیونکہ انہیں اپنے بھاری اجسام کو

اٹھانے اور حرکت دینے کے لیے ایسا ہی ڈھانچہ درکار تھا۔ اس کے مقابلے میں پرندوں کی ہڈیاں جسم کے تناسب سے کم ہلکی اور کھوکھلی ہوتی ہیں۔

☆ ڈائنوسارز کا نظام تحویلی (Metabolic System) جانوروں کی دنیا میں سب سے سست ہے جبکہ پرندوں میں یہ نظام سب سے تیز ہوتا ہے، کیونکہ پرندوں کو اڑان کے لیے بہت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ ڈائنوسارز کے کھپرے (scales) ٹھوس کیراٹین سے بنے ہوتے ہیں جبکہ پرندوں کے پَر کھوکھلے اور کیروٹین کی ایک اور قسم سے تشکیل پاتے ہیں۔

☆ پرندوں کا نظامِ تنفس (Respiratory System) ڈائنوسارز بلکہ دیگر تمام چوپایوں / جانداروں سے یکسر مختلف ہے۔ پرندوں کے پھیپھڑوں میں ہوا ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ پرندوں کے پیٹ میں بھی ہوا کی تھیلیاں موجود ہوتی ہیں جن سے ہوا گزرتی ہے، اس طرح ان کے جسم کو پھیپھڑوں سے مسلسل آکسیجن ملتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس ڈائنوسارز، انسانوں اور چوپایوں میں پھیپھڑوں کی نالیاں آخر میں بند ہوتی ہیں اور اس میں ہوا داخل ہو کر واپس بھی اسی راستے سے نکل جاتی ہے۔

کسی بھی جانور کو زندہ رہنے کے لیے مسلسل سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اس نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تو دورانِ تبدیلی (جو بقول ماہرین ارتقاء کروڑوں سالوں پر محیط ہے) اس جاندار کی موت یقینی ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک زمینی جاندار کے پھیپھڑوں کا پرندے کے پھیپھڑوں میں تبدیل ہو جانا قطعی ناممکن ہے۔

مائیکل ڈینٹون جو نیوزی لینڈ کی اوٹاگا یونیورسٹی میں Molecular Biologist ہیں ان کا کہنا ہے کہ نظریہ ارتقا کی رو سے ڈائنوسارز کے پھیپھڑوں کی پرندوں کے پھیپھڑوں میں تبدیلی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

پرندوں کے فاسلز اور ان کی کہانیاں

علمائے ارتقاء فوسلی شہادت کے سلسلے میں ایک پرندے Archaeopterics کو ڈائنوسارز سے پرندے کے ارتقاء کے درمیان کی ایک عبوری شکل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ موجودہ پرندوں کا جدِ اعلیٰ ہے جو ۱۵۰ ملین سال پہلے اپنے آباء و اَجداد سے الگ ہو کر اڑنا شروع ہوا۔ تحقیقی مقالوں کے مطابق یہ آدھا پرندہ تھا جو اُڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی کہا

گیا کہ پرندوں کے برعکس اس کے سینے کی ہڈی (sternum) نہیں تھی۔لیکن ۱۹۹۲ء میں ایک اور آرکی آپٹیرکس کا فاسل مل گیا' جس میں سینے کی ہڈی مل گئی' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے اڑنے میں مدد دینے والے پٹھے بڑے مضبوط ہوتے تھے۔ جہاں تک اس کے چھوٹے پروں کا تعلق ہے تو آج کل کی مرغیوں' جنگلی مرغ' مختلف فیزنٹس حتیٰ کہ کیوی اور شتر مرغ میں بھی جسم کے لحاظ سے چھوٹے پَر پائے جاتے ہیں' جو دراصل چھوٹی اڑان یا نہ اڑنے والے پرندوں میں پائے جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آرکی آپٹیرکس کے پروں میں پنجے اور چونچ میں دانت بھی ہوتے تھے' لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا ریپٹائلز/ڈائنوسارز سے کوئی تعلق ہے۔آج بھی ٹورا کو (ایک افریقی سبز پروں اور سرخ کلغی والا پرندہ) اور ایک امریکی پرندہ ہوکزین ایسے پرندے ہیں جن کے چمگادڑوں کی طرح بازوؤں میں پنجے ہوتے ہیں' جو شاخوں سے لٹکنے میں مدد دیتے ہیں۔ جہاں تک آرکی آپٹیرکس کی چونچ میں دانتوں کا تعلق ہے تو اسے اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔آج کے دور میں بھی کچھ رینگنے والے جانوروں کے دانت ہوتے ہیں اور کچھ کے نہیں۔ جیسے کچھوا ایک ریپٹائل ہے' لیکن اس کے منہ کی بجائے چونچ ہوتی ہے اور اس میں دانت نہیں ہوتے۔ جدید تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آرکی آپٹیرکس کے دانتوں کی اناٹومی ڈائنوسارز کے دانتوں سے بالکل مختلف ہے۔ آرکی آپٹیرکس کے کانوں کی ساخت بھی ڈائنوسارز کی بجائے پرندوں سے ملتی ہے۔

۱۹۹۵ء میں دو چینی ماہرین طبقات الارض نے ایک نئے پرندے کا حجری ڈھانچہ دریافت کیا اور اس کا نام کنفیوشس آرنس رکھا۔اس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی آرکی آپٹیرکس کی طرح تھا' لیکن اس کی چونچ میں دانت نہیں تھے۔ پرندوں کی دم کو کنٹرول کرنے والا حصہ (pygostyle) بھی اس میں موجود تھا۔ یہ ڈھانچہ بھی آرکی آپٹیرکس جتنا پرانا ہے۔ ہر لحاظ سے بالکل دور جدید کا پرندہ لگتا ہے۔ اسی طرح ۱۹۹۶ء میں چین میں ہی ایک اور ڈھانچہ دریافت ہوا۔اس میں اور آج کے پرندے میں صرف دانتوں کا فرق ہے۔اس کے متعلق ایک مضمون ۱۹۹۷ء میں مشہور رسالہ Discovery میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا ''پرندے کہاں سے آئے؟ یہ فاسل بتاتا ہے کہ پرندے ڈائنوسارز کے سٹاک سے پیدا نہیں ہوئے۔''

اس کے باوجود ارتقاء کے حامیوں نے ہار نہیں مانی اور اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے

لیے جھوٹ اور جعلسازی کا بھی سہارا لے کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً نیشنل جیوگرافک کے نومبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ایک مضمون میں چین سے ملنے والے ایک فاسل کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ اس میں ڈائنوسارز اور پرندے' دونوں کے خدوخال موجود ہیں۔اس کی بہت تشہیر کی گئی اور اسے Archaeoraptor Lioningevesis کا نام بھی دے دیا گیا۔

نیشنل جیوگرافک رسالے نے اس پر ایک زبردست مضمون لکھا اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ اس فاسل سے پرندوں کا ارتقاء اور اس کا منظر نامہ تصدیق ہو چکا ہے اور اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ گیا۔ دراصل یہ چند چینی لوگوں کی حرکت تھی جنہوں نے ۸۸ عدد ہڈیوں اور پتھر کے ٹکڑوں کو گوند اور سیمنٹ سے جوڑ کر یہ ''شاہکار'' تخلیق کیا تھا۔ سائنس دانوں کے ایک گروہ نے جب اس کا تنقیدی نظروں سے تفصیلی معائنہ کیا اور ایکسرے کمپیوٹر ٹوموگرافی سے اسے پرکھا تو معلوم ہوا کہ اسے بنانے میں قدیم پرندے کے ڈھانچے کے اگلے حصے کو استعمال کیا گیا جبکہ جسم اور دم بنانے کے لیے چار مختلف پرندوں کے فاسلز کو بروئے کار لایا گیا۔

ڈاکٹر سٹورس آلسن جو مشہور زمانہ اسمتھ سونین ادارہ نیچرل ہسٹری میوزیم آف امریکہ کے پرندوں کے شعبے کے سربراہ تھے' انہوں نے درج بالا مضمون شائع ہونے سے پہلے ہی رسالے کی انتظامیہ کو بذریعہ خط آگاہ کر دیا تھا کہ یہ فاسل جعلسازی کا نتیجہ ہے۔لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ اس کے باوجود یہ مضمون شائع ہوا' جس پر بعد میں بھی کوئی معذرت نہیں کی گئی۔ بقول آلسن ''نیشنل جیوگرافک نے یہ مضمون شائع کر کے اپنی زندگی کی سب سے کمتر' گھٹیا' سنسنی خیز' فضول و بے بنیاد بڑی بڑی سرخیاں لگانے والی صحافت جیسی حرکت کی۔''

انسان کا ارتقاء

ڈارون نے انسانی ارتقاء کے بارے میں اپنی کتاب Descent of Man (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان کے جدِاعلیٰ قدیم دور کے بن مانس' چمپینزی اور اورنگوٹان (بندر کی ایک قسم) ہیں' جو درختوں پر بسیرا کیا کرتے تھے۔ یہ چار پائے کسی کنگرو وغیرہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کا مورث اعلیٰ کوئی مگرمچھ وغیرہ تھا۔ یہ مگرمچھ مچھلیوں سے ترقی کر کے خشکی پر رہنا شروع ہوئے تھے۔مچھلیاں سیپیوں گھونگھوں وغیرہ کی ترقی یافتہ اقسام ہیں' وغیرہ وغیرہ۔آپ خود اندازہ لگالیں کہ یہ نظریہ کتنا غیر سائنسی اور

غیر منطقی ہے۔ ماہرین ارتقاء نے انسان کا جو فرضی شجرہ نسب بنایا ہے اس کے مطابق انسان کے آباء و اَجداد کا تعلق انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر چلنے والے بندر جیسے انسان سے ہوا جسے آسٹرالوپتھیکس (Australopethecus) کا نام دیا گیا' جو رفتہ رفتہ ہوموہیبلس (Homo Habilus) میں تبدیل ہوا۔ اس کے بعد وہ ہوموار یکٹس (Homo Erectus) بن گیا' جو بتدریج ارتقاء پذیر ہو کر آخر میں موجودہ انسان (Homo Sapien) بن گیا۔

لیکن فاسل ریکارڈ اور ارضی حقائق اس کے برعکس یہ بتاتے ہیں کہ یہ ساری اقسام ایک ہی دور میں بیک وقت دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود تھیں۔ پھر یہ ایک دوسرے کے آباء و اَجداد کیسے ہو سکتے ہیں؟ کہا گیا کہ ہوموہیبلس کا دماغ آسٹرالوپتھیکس سے بڑا ہے اور وہ زیادہ سیدھا ہو کر دو ٹانگوں پر چل سکتا ہے۔ یہ خیال اپنی ضرورت کے تحت گھڑا گیا تا کہ انسانی ارتقاء ثابت کیا جا سکے۔ امریکی عالمہ علم البشر ہولی سمتھ نے ۱۹۹۴ء میں تفصیلی مطالعہ اور تحقیق کے بعد کہا کہ ہوموہیبلس آدمی نہیں بلکہ بغیر کسی شک کے بندر ہے جو جھک کر چلتا ہے۔ اسی طرح ہوموار یکٹس کے بارے میں رچرڈ لیکے نے' جو خود عالم ارتقاء ہے' کہا کہ اس میں اور جدید آدمی میں سوائے نسلی فرق کے اور کوئی فرق نہیں۔

۲۰۰۰ء میں امریکہ میں ایک کانفرنس ہوئی جسے سنکن برگ کانفرنس کہا جاتا ہے۔ اس میں ہوموار یکٹس کا خاندانی پس منظر تفصیل سے زیر بحث آیا۔ اس کانفرنس کا لُبِ لُباب یہ تھا کہ ہوموار یکٹس کا کوئی علیحدہ وجود نہیں' یہ انسانی ڈھانچہ ہے۔ لہٰذا پہلا آدمی جو فاسل میں ظاہر ہوا وہ اچانک ہوا' اس کی کوئی ارتقائی تاریخ نہیں ہے۔

نی اینڈرتھال انسان

یہ وہ لوگ تھے جو ایک لاکھ سال پہلے یورپ میں پیدا ہوئے اور آج سے ۳۵ ہزار سال پہلے یا تو ناپید ہو گئے یا دوسری انسانی نسلوں کے ساتھ اختلاط کے سبب منظر عام سے ہٹ گئے۔ موجودہ انسان اور ان میں فرق صرف یہ تھا کہ ان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ زیادہ بھاری اور مضبوط تھا اور کھوپڑی کی گنجائش بھی ذرا زیادہ تھی۔ لیکن فاسل اور ارضی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے' اپنے بیماروں کا خیال رکھتے تھے اور زیورات وغیرہ زیب تن کرتے تھے۔ ارضی کھدائی سے ہڈی سے بنی ہوئی کپڑے سینے والی سوئی بھی برآمد ہوئی۔ ایسے مکمل انسان کو آپ قدیم درمیانی قسم کا آدھا جانور اور آدھا انسان کیسے کہہ سکتے ہیں؟

پلٹ ڈاؤن آدمی

۱۹۱۲ء میں ایک عالم طبقات الارض چارلس ڈاسن نے کہا کہ اسے ایک جبڑے کی ہڈی اور کھوپڑی کا ٹکڑا پلٹ ڈاؤن انگلینڈ کے ایک غار سے ملا ہے۔ اسے پلٹ ڈاؤن آدمی کا نام دیا گیا اور اس کی عمر ۵ لاکھ سال بتائی گئی۔ اس پر مقالے لکھے گئے اور ۴۰ سال تک اسے انسانی ارتقاء کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔ ۱۹۴۹ء میں کیتھ اوکلے جو کہ برطانوی عجائب گھروں کے فاسلز کے شعبے سے متعلق تھا' اس نے جدید ٹیکنالوجی استعمال کر کے انکشاف کیا کہ یہ نمونہ تو محض چند سال پرانا تھا' بس کھوپڑی ۵۰۰ سال پرانی نکلی۔

۱۹۵۳ء میں جب یہ جعلسازی عام آدمی تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کھوپڑی میں بندر کے ایک سو ساٹھ سالہ جبڑے کو جعلی طریقے سے چپکایا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نمونے کو برطانیہ کے عجائب گھر سے اٹھا لیا گیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس بنیاد پر جو مقالے اور کتابیں لکھی گئیں ان کو جھوٹا نہیں کہا گیا۔ وہ بدستور ریکارڈ پر موجود ہیں۔

نبراسکا کا آدمی

''امریکن نیچرل ہسٹری'' کے ایڈیٹر ہنری فیرفیلڈ اوسبرن نے ۱۹۲۲ء میں ایک داڑھ کا دانت دریافت کرنے کا دعویٰ کیا جس کے خدوخال عموماً آدمی اور بندر سے ملتے تھے۔ اس پر تحقیق شروع ہوئی اور اس دانت کو اس کے بقول آدمی سے قریب تر نسل (Pithecanthropus Erectus) کا دانت قرار دے دیا گیا۔ نبراسکا کے علاقے سے ملنے کی بنا پر اسے ''نبراسکا کا آدمی'' کا نام دے دیا گیا۔ اس ایک دانت کی بنیاد پر نہ صرف پورے آدمی کے جسم کی تصویر کشی کی گئی بلکہ اس کی بیوی بچے بھی ساتھ کھڑے دکھا دیے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں اسی ڈھانچے کے دوسرے حصے بھی مل گئے جس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ کسی انسان یا بندر کی بجائے ایک ناپید امریکی سور کا دانت تھا۔

دنیا میں اب تک دریافت ہوئے فاسلز یا تو بندروں کے ہیں یا انسانوں کے۔ کوئی درمیانی کڑی جو یہ ثابت کر سکے کہ انسان بندروں سے ارتقاء پذیر ہوئے' اب بھی مفقود ہے۔ جہاں تک ان کھوپڑیوں کے اوپر تصوراتی انسانی یا نیم انسانی شکل وصورت بنانے کا تعلق ہے تو یہ ماہرینِ ارتقاء کی بے جا ضد کا مصورانہ اظہار ہے۔ کسی بھی کھوپڑی پر موٹے پتلے ہونٹ' چپٹی تیکھی ناک اور دیگر نقوش بنائے جا سکتے ہیں۔ ارتقائی مصور کسی بھی بندر یا انسان کی کھوپڑی

پر ایک عظیم فلسفی کے نقش و نگار یا کسی چمپنزی کے خدوخال چسپاں کر سکتے ہیں اور انہیں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ استعمال کر کے تمام انسانوں پر ٹھونس سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اندھے عقیدے سے ہٹ کر کبھی نہیں مان سکتے کہ یہ سب کچھ خود بخود اتفاق سے وجود میں نہیں آیا بلکہ اسے کسی عظیم خالق نے کسی حکمت کے تحت پیدا کیا ہے۔ الٹا وہ مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ڈارون کے نظریے کو محض اس لیے نہیں مان رہے کہ اس صورت میں انہیں خدا کے وجود سے انکار کرنا پڑتا ہے۔

ارتقاء پذیر انسان کے لیے چوپایہ ہونا بہتر تھا یا دوپایہ؟

قدرتی انتخاب (Natural Selection) کے حوالے سے Survival of the fittest کا اصول دیکھا جائے تو ابتدائی انسان کے لیے چار پاؤں پر چلنا زیادہ فائدہ مند تھا۔ اس کے لمبے بازو (اگلی ٹانگیں) درختوں پر چڑھنے اور ایک درخت سے دوسرے درخت تک چھلانگ لگانے کے لیے زیادہ موزوں ہوتے۔ دو پاؤں ہونے کی صورت میں تو اسے ایک درخت سے دوسرے درخت تک پہنچنے کے لیے درخت سے اتر کر دوسرے درخت پر چڑھنا پڑتا جو نسبتاً مشکل اور خطرناک ہوتا۔ پھر درختوں پر وہ زمین کی نسبت زیادہ محفوظ ہوتا۔ چار پاؤں کی مدد سے جانور انسان کی نسبت بہت تیز بھاگ سکتا ہے' جو اسے شکار کرنے اور شکار ہونے سے بچنے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتے۔ چند جانور ایسے ہیں جو غذا کی تلاش وغیرہ کے لیے تھوڑا بہت دو پاؤں پر چل سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ دیر کے لیے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ زیادہ تر چار پاؤں پر چلنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا ارتقاء کی منطق کے حوالے سے تو بندروں کے لیے دو کی بجائے چار پاؤں پر چلنا ہی زیادہ سودمند ہوتا۔ پھر یہ دو پاؤں پر کیوں چلنے لگے؟

لیورپول یونیورسٹی کے شعبہ تشریح الابدان (Anatomy) کے ماہر رابن کرامپٹن کہتے ہیں کہ ''ایک فرد یا تو سیدھا کھڑا ہو کر چل سکتا ہے یا اپنے چار پاؤں پر۔ ایک ایسی چال جو ان دونوں کے درمیان ہو' یعنی وہ فرد کبھی آدھا جھک کر چلتا ہو' ناممکن ہے' کیونکہ ایسا کرنے کے لیے اسے بے پناہ قوت درکار ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نصف دوپایہ یا نصف چار پایہ زندہ نہیں رہ سکتا۔''

لہٰذا یہ سوال کہ وہ دو ٹانگوں پر چلنا کیوں اور کیسے شروع ہوئے؟ انہوں نے اپنی پشم یا بالوں سے بھرپور کھال کیسے کھودی؟ (جو ان کے لیے نقصان کی بجائے فائدہ مند تھی!) دیگر جانداروں کی نسبت ان کے دماغ کا حجم اتنا بڑا کیسے ہو گیا؟ انسان نے بولنے اور لکھنے کا فن

کیسے سیکھ لیا؟ جبکہ بندر یا دیگر جانور سوائے چند آوازوں کے کچھ نہیں بول سکتے۔ ابھی تک ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا۔

انسانی یا حیوانی آنکھ

انسانی یا حیوانی آنکھ کا ڈیزائن اور عمل بے حد پیچیدہ' مرکب اور اکمل ہے۔ آنکھ کو صحیح طریقے سے کام کرنے کے لیے چالیس سے زیادہ اجزاء یا حصوں کو ایک مربوط نظام کے تحت بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ مثلاً پلکیں' آنکھ کا عدسہ' پتلی' پردہ شبکیہ (retina)' اعصاب اور عضلات وغیرہ۔ حتیٰ کہ آنکھوں کو تر رکھنے کے لیے آنسو جیسا مادہ نہ بنے تو چند گھنٹوں میں بینائی ختم ہو جائے۔

کیا نظریہ ارتقاء کے تحت بصارت کے لیے ایسے درجنوں نظاموں کا خود بخود پیدا ہونا ممکن ہے جو آپس میں زبردست انداز میں مربوط بھی ہوں؟ خود ڈارون بھی اس کی کوئی تسلی بخش توجیہہ پیش نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے ایک خط میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ ''مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب اس آنکھ کے تصور سے میرا تمام جسم سرد پڑ گیا تھا۔''

کسی جسم کی شبیہ جب پردہ شبکیہ (retina) پر پڑتی ہے (پردۂ شبکیہ کی اانتہیں ہوتی ہیں اور ہر تہہ کا اپنا کام ہے) تو اس شبیہ کے برقی لہروں میں تبدیل ہو کر دماغ کے متعلقہ علاقے تک پہنچنے اور پھر اسے پڑھنے (read) کا عمل اور اس کے ردعمل کا نظام اس قدر پیچیدہ اور حیران کن ہے کہ اس کے بیان کے لیے کئی ضخیم جلدوں کی ضرورت پڑے گی۔ ابھی بھی یہ عمل پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا اور اس پر تحقیق جاری ہے۔

کیڑوں مکوڑوں کی آنکھیں

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بصارت کے دس کے قریب نظام بنائے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں مثلاً جھینگے اور لابسٹر (Lobster) میں قدرت نے انسانی آنکھ کے انعطافی نظام کی بجائے انعکاسی نظام کے تحت آنکھیں بنائی ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں مثلاً شہد کی مکھی یا بھڑ کی آنکھوں کو مرکب آنکھیں کہا جاتا ہے' کیونکہ ان کی ایک آنکھ اصل میں ہزاروں چھوٹی چھوٹی سادہ آنکھوں سے بنی ہوتی ہیں جو تمام مل کر کسی چیز کا عکس مکمل کرتی ہیں (جبکہ انسانی آنکھ میں صرف ایک ہی عدسہ (lens) ہوتا ہے۔

کیڑوں کی آنکھیں کسی چیز کا بہت واضح عکس نہیں بناتیں' تاہم وہ زیادہ علاقہ دیکھ سکتی ہیں اور ذرا سی بھی حرکت خواہ کتنی تیز ہو' اسے محسوس کر کے اپنا دفاع کر سکتی ہیں۔

کروڑوں سال پہلے کے سمندری حشرات (trilobites) کے فاسلز کے معائنے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان کی آنکھوں اور آج کی شہد کی مکھی اور ڈریگن فلائی (dragon fly) کی آنکھوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قدیم حشرات بھی پیچیدہ اجسام اور دوہرے عدسے والی مرکب آنکھوں کے مالک تھے۔ ان مکمل اور پیچیدہ آنکھوں کے نظام میں کروڑوں سال بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

چمگادڑ ہمیشہ چمگادڑ ہی تھے

چمگادڑ دودھ دینے والے جانوروں (mammals) کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ پرندہ نہ ہونے کے باوجود فضا میں بہت اچھے انداز سے نہ صرف اڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ رات کے اندھیرے میں دورانِ پرواز اڑتے ہوئے کیڑوں پتنگوں کا کامیابی سے شکار بھی کرتا ہے۔ چمگادڑ کے جو کروڑوں سال پرانے فاسلز دریافت ہوئے ہیں' ان میں اور آج کے چمگادڑ میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔ اُس وقت بھی وہ ماہرانہ انداز میں پرواز کرتے تھے اور اڑتے ہوئے کیڑوں پتنگوں کا شکار کرتے تھے۔

چمگادڑ کی نظر کمزور ہوتی ہے' لیکن گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی وہ زمین اور فضا میں اپنے شکار کو بخوبی ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اس کے لیے وہ عجیب طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسے سونار سسٹم (sonar system) کہتے ہیں۔ الٹراساؤنڈ مشین بھی اسی اصول پر کام کرتی ہے۔ چمگادڑ اپنے منہ سے مسلسل اونچی فریکونسی کی صوتی لہریں (high frequency ultrasound waves) خارج کرتا رہتا ہے۔ جب یہ لہریں شکار یا دیگر اجسام سے ٹکرا کر بازگشت کی صورت میں واپس آتی ہیں تو چمگادڑ کا دماغ ان کا تجزیہ کر کے ماحول کا ایک نقشہ ترتیب دیتا ہے اور متعلقہ عضلات کو اعصاب کے ذریعے اطلاع دے کر اپنے جسم کی حرکت سے مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ چمگادڑ یہ الٹراساؤنڈ سگنل شکار کی رفتار اور سمت کے مطابق تبدیل بھی کرتا رہتا ہے تاکہ اس کا دماغ ماحول کی صحیح تصویر کشی کر سکے۔

اب پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسا پیچیدہ اور مکمل الٹراساؤنڈ نظام جو بیک وقت بہت سے اعضاء کے باہمی روابط اور تال میل سے تشکیل پاتا ہے' اتفاقاً کیسے وجود میں آ گیا؟ اور اگر ایسا

قدرتی انتخاب (Natural Selection) کے ذریعے آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوا ہے تو چمگادڑ دورانِ تبدیلی ایک ادھورے نظام کے ساتھ کس طرح کامیابی سے زندہ رہا ہوگا؟ لیکن حقیقت میں ایسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ چمگادڑ کروڑوں سال پہلے بھی چمگادڑ ہی تھے۔

نوبل انعام اور جھوٹ

نوبل انعام یافتہ ماہرِ حیاتیات جیک زوستک (Jack Szostak) نے' جس کا تعلق ہارورڈ یونیورسٹی سے ہے' دعویٰ کیا کہ اس نے ایک ایسا طریقہ دریافت کیا ہے جس سے RNA اپنی نقل خود تیار (self replicate) کر لیتا ہے۔ گویا اپنی نسل بڑھا لیتا ہے۔

یہ مقالہ (research paper) ۲۰۱۶ء میں بین الاقوامی تحقیقی جریدے Nature Chemistry میں ایک نئی عظیم الشان دریافت کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس تحقیق سے نظریۂ ارتقاء کے حامیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ ثبوت مل گیا کہ زندگی اچانک وجود میں آئی تھی اور پھر یہ خود ہی افزائشِ نسل کرنے لگی۔

اصل میں موضوعِ تحقیق یہ تھا کہ کیا ضروری خامروں (enzymes) اور پروٹینز کے بغیر RNA اپنی نقل (duplicate) تیار کر سکتا ہے؟ اس تحقیق کی بنیاد ہارورڈ یونیورسٹی ہی کے ماہر کیمیا (Chemist) والٹر گلبرٹ (Walter Gilbert) کا ۱۹۸۶ء کا یہ دعویٰ تھا کہ اربوں سال پہلے کسی نہ کسی طرح اپنی نقل تیار کرنے والا RNA کا سالمہ خود بخود وجود میں آ گیا تھا۔ بہرحال زوستک کو ایک سال کے اندر ہی اپنا مقالہ معافی اور معذرت کے ساتھ واپس لینا پڑا' کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ اس سے آپ دنیا کی بہترین علمی درسگاہ کے نوبل انعام یافتہ عالم کے علمی اور اخلاقی معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہوا یوں کہ ہارورڈ یونیورسٹی کی اسی لیبارٹری میں ایک اور پوسٹ پی ایچ ڈی محقق ٹیولی اولسن (Tivoli Olson) نے متعدد بار ویسے ہی تجربات کیے' مگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکا۔ اس کی بنا پر اسے کہنا پڑا کہ زوستک نے تجربات سے غلط نتائج اخذ کیے تھے۔ بالآخر زوستک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے غلط دعویٰ کیا تھا۔ ہمارے نزدیک تو جھوٹ بولنے کا نوبل انعام بھی زوستک کو ہی ملنا چاہیے۔

نظریۂ ارتقاء دورِ حاضر کا سب سے بڑا جھوٹ ہے' جس پر کوئی عقلی اور تجرباتی دلیل نہ ہونے کے باوجود اندھا یقین رکھا جاتا ہے۔ کوئی معمولی ذہن رکھنے والا شخص بھی یہ کہنے کی غلطی

نہیں کرے گا کہ کیمرہ خود بخود اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود دنیا کے بہت سے ہوش مند پڑھے لکھے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاروِنزم ایک سائنسی حقیقت کی بجائے ایک عقیدے کا نام ہے جو منکرینِ خدا نے اپنے دفاع میں گھڑ رکھا ہے۔ سر آرتھر کیتھ' جو خود بھی ارتقاء کا حامی ہے' یہ کہنے پر مجبور ہے کہ نظریۂ ارتقاء (Evolution Theory) ایک مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کی بجائے ایک عقیدہ ہے۔ (جو خدا کو نہ ماننے کی ضد کی بنا پر مجبوراً اپنانا پڑتا ہے۔)

ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا میں ڈاروِنزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد توجیہہ بلا مشاہدہ (explanation without demonstration) پر قائم ہے۔

پھر بھی ایسی ناقابل مشاہدہ اور ناقابل تجربہ چیز کو ایک علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اس کی وجہ اے ای ہنڈر (A.E.Hender) کے الفاظ میں یہ ہے:

(۱) یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ ہے۔

(۲) اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہہ مل جاتی ہے جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔

(۳) دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔

لیکن دیکھا جائے تو یہی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خالق ہونے کے نظریے کے حق میں زیادہ شدت و وثوق کے ساتھ دی جا سکتی ہے' اور ایسا کرنے سے زندگی کی تخلیق کے بارے میں سارے شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں اور ہر سوال کا کامل جواب مل جاتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک ہی طریق استدلال سے ڈاروِن کے حامی اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہی دلائل ان کے نظریات کی نفی بھی کرتے ہیں۔ علم ارتقاء کے ماہرین کے تجربات اور ان سے اخذ کردہ نتائج کی مثال کچھ اس طرح ہے۔ لیبارٹری ٹیبل پر استاد نے ایک مینڈک رکھا اور اس کے سر کے پاس تالی بجائی۔ مینڈک پھدک کر دور جا گرا۔ استاد نے مینڈک پکڑ کر اس کی پچھلی ٹانگ کاٹ دی اور ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ تالی بجائی۔ مینڈک تھوڑا سا پھدکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ استاد نے پکڑ کر اس کی دوسری ٹانگ بھی کاٹ دی اور پھر وہی تجربہ دہرایا۔ مینڈک بے چارہ وہیں پڑا رہا۔ استاد نے بچوں سے پوچھا: بچو! آپ نے اس تجربے سے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ ایک طالب علم نے ہاتھ اٹھایا اور بولا: سر! اس تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

اگر مینڈک کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی جائیں تو وہ سن نہیں سکتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (البقرۃ)

''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے' اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے' اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الجاثیۃ)

''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور باوجود سمجھ بوجھ کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ اب ایسے شخص کو اللہ کے سوا کون ہدایت دے سکتا ہے؟ تو کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''اور کفار کی مثال ان جانوروں کی طرح ہے جو (چرواہے کی) صرف پکار اور آواز ہی کو سنتے ہیں (سمجھتے نہیں)۔ وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں' انہیں عقل نہیں۔''

کفار سے تو ہمارا گلہ بنتا ہی نہیں' لیکن ہمارے اپنے تعلیمی اداروں میں ڈاروِن کے نظریے کو پڑھایا یعنی تسلیم کیا جا رہا ہے جب کہ اس کے رد یا ابطال کے لیے طلبہ کو کچھ نہیں بتایا جاتا۔ کیا ہم نادانستہ طور پر اسلامی معاشرے میں ملحدانہ سوچ کو فروغ نہیں دے رہے؟ کیا یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ نہیں؟ ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

اعلان داخلہ
2019-20ء

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کُلیۃ القرآن لاہور

(1) درسِ نظامی (آٹھ سالہ کورس) مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے

اہلیت: مڈل پاس، جبکہ میٹرک پاس کو ترجیح دی جائے گی۔

(2) دراساتِ دینیہ (دوسالہ کورس) مع انٹرمیڈیٹ آئی کام۔ جنرل سائنس

اہلیت: میٹرک سائنس: 60 فیصد (کم سے کم) نمبروں کے ساتھ

- میٹرک کے نتائج کا انتظار کرنے والے طلبہ بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔
- ذہین اور مستحق طلبہ تعلیمی وظائف کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔
- ہوسٹل میں محدود نشستیں دستیاب ہیں۔

داخلے کا آغاز

21 جون 2019ء

داخلہ کے خواہش مند طلبہ اپنی سابقہ اسناد، اپنے اور والد/سرپرست کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور 3 عدد تصاویر ہمراہ لائیں۔

برائے رابطہ
191-A اتاترک بلاک
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور
فون نمبر: 042-35833637
0301-4882395

July 2019
Vol.68
Regd. CPL No.115
No.7
Monthly Meesaq Lahore